پناکو کے کارنامے

سعید لخت

پنوکو کے کارنامے

کارلو کولودی

سعید لخت

فیروز سنز لمیٹڈ

چند باتیں

”پناکو کے کارنامے“ لکھنے والے کا اصلی نام کارلو فورِن زینی(Carlo Lorenzini) تھا۔ لیکن اُس نے یہ کتاب ”کولودی“ کے فرضی نام سے لکھی ہے۔ کولودی اٹلی کے مشہور شہر فلورنس میں رہتا تھا۔ بچپن میں پناکو ہی کی طرح شریر تھا۔ جب اسکول میں پڑھتا تھا تو اُس نے اپنے ایک ہم جماعت کی پتلون پر اُس کی تصویر بنا دی۔ لڑکے تصویر دیکھ کر بہت

ہنسے لیکن یہ مذاق ”کولودی“ کو مہنگا پڑا۔ اُستاد نے سزا دی۔ اُسے سب سے الگ بٹھا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کولودی نے شرارتیں چھوڑ دیں۔

کولودی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کئی سرکاری عہدوں پر رہا۔ پھر اُس نے چھوٹا سا اخبار نکالا۔ جب پچاس سال کا تھا تو بچّوں کی دو کتابیں ترجمہ کیں۔ اِس کے بعد اُس نے بچّوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ اُس نے پناکو کی کہانی لکھ کر بچّوں کے رسالے میں بھیجی۔ یہ کہانی چھپی تو سارے اٹلی میں مشہور ہو گئی۔ اب کولودی اِس کہانی کو مسلسل لکھنے لگا۔ کہانی رسالے میں چھپنے کے بعد کتاب کی صورت میں شائع کر دی گئی۔

یہ کتاب نہ صرف اٹلی میں مشہور ہوئی بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی بہت پسند کی گئی۔ کئی زبانوں میں اِس کے ترجمے ہوئے۔ کہنے کو تو یہ ایک کٹھ پُتلے کی کہانی ہے لیکن اِسے پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ہم سچ مچ کے بچّے کی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ ہر بچّہ چاہے کسی ملک کا ہو، ہنستا کھیلتا اور

شرارتیں کرتا ہے۔ بچّے غلطیاں بھی کرتے ہیں لیکن جو بچّہ جلدی سنبھل جاتا اور اپنے آپ کو ٹھیک کرلیتا ہے، وہ ترقّی، عزّت اور شہرت حاصل کرتا ہے۔

سعید لخت صاحب بچوں کے مشہور اور مقبول ادیب ہیں۔ اُنھوں نے اس کتاب کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس میں ضروری ردّ و بدل کی ہے اور اِسے اپنے پیارے اور چٹ پٹے انداز میں اِس خوب صورتی سے لکھا ہے کہ یہ ہماری زبان اور ہمارے ہی بچّوں کی ایک یاد گار کہانی بن گئی ہے۔ سعید لخت صاحب اِسے تعلیم و تربیت میں قسطوں میں پیش کرتے رہے ہیں اور بعد میں یہ کتابی صورت میں بھی چھاپی گئی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ۔۔۔

تُم جھٹ بول اُٹھو گے کہ "ایک بادشاہ تھا۔"

نہیں۔ میرے پیارے بچّو! یہ کسی بادشاہ کی کہانی نہیں۔ بلکہ ایک چھوٹے سے، معمولی سے لکڑی کے ٹکڑے کا قصّہ ہے جو بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ تمہاری امّی چولہے میں جلاتی ہیں۔ لکڑی کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا بہت دِنوں سے ایک بڑھئی کی دُکان میں پڑا ہوا تھا۔ اس بڑھئی کا نام تھا 'انتونیو' مگر آس پاس کے شریر بچّے اُسے 'چچا ٹماٹر' کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کیونکہ اس کی ناک پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح سُرخ اور چمکیلی تھی۔

تو بھئی! ایک دِن خُدا کا کرنا کیا ہوا کہ انتونیو کی نظر لکڑی کے اس ٹکڑے پر پڑ گئی۔ وہ خوشی سے ہاتھ مل کر بولا:

"آہا۔۔۔! اسی کی تو مُجھے تلاش تھی۔ اس لکڑی سے میز کی ٹانگ بہت اچھّی بن سکتی ہے۔"

اس نے بسولا اُٹھایا کہ اسے چھیل چھال کر صاف کرے مگر ابھی بسولا

لکڑی پر پڑا بھی نہ تھا کہ ایک باریک سی آواز آئی:

"ذرا آہستہ سے مارنا۔"

بڑھئی کا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھارہ گیا۔ اس نے ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا، میز کے نیچے، اوزاروں کے بکس کے پیچھے۔ دُکان کا کونا کونا چھان مارا۔ دروازہ کھول کر باہر بھی جھانک لیا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

بڑھئی نے کھسیانا ہو کر چندیا سہلائی اور قہقہہ لگا کر بولا۔ "توبہ توبہ! میں بھی کتنا بےوقوف ہوں۔ یہ سب میرا وہم ہے۔"

اُس نے پھر بسولا اُٹھایا اور زور سے لکڑی پر مارا۔ ایک دم کسی نے زور سے چیخ ماری اور بلبلا کر بولا۔ "ہائے! تُم نے مُجھے مار ہی ڈالا۔"

یہ سُن کر بڑھئی کی سٹّی گُم ہو گئی۔ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ زبان لٹک گئی اور وہ پتھّر کی بے جان مورتی کی طرح چُپ چاپ لکڑی کے اس ٹکڑے کو

حیرت سے تکنے لگا۔

جب حواس ذرا ٹھکانے ہوئے تو وہ بڑبڑا کر بولا:

”یا اللہ! کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا لکڑی کا بے جان ٹکڑا بھی بول سکتا ہے؟ کہیں اس کے اندر کوئی جِن تو چھپا ہوا نہیں؟“

وہ سر پکڑ کے دھم سے زمیں پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت، اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے بھائی؟ اندر آجاؤ!“ بڑھئی نے جواب دیا۔

ایک ناٹے سے قد کا بُڈّھا اندر داخل ہوا۔ اس کا نام ’گیپتو‘ تھا۔۔۔ گیپے تو۔۔۔ اُسے کریلوں سے بہت نفرت تھی۔محلّے کے بچّوں نے کریلا اُس کی چڑِ بنالی تھی اور جب وہ باہر نکلتا تو اسے ”ماموں کریلا۔ماموں کریلا۔“ کہہ کر دِق کیا کرتے۔

"آداب عرض ہے۔ بھائی انتونیو!" گیپیتو نے کہا۔ "خیر تو ہے! یہ اس طرح زمین پر کیوں بیٹھے ہو؟"

"چیونٹیوں کو سبق پڑھا رہا ہوں۔" انتونیو نے کہا۔

"اچھّا دھندا سوچا ہے۔" گیپیتو نے ہنس کر کہا۔ "خُدا برکت دے!"

"تُم اپنی کہو، کس طرح آئے؟ انتونیو نے جل کر پوچھا۔

"پیروں سے چل کر۔" گیپیتو مُسکرا کر بولا۔ "خیر! یہ تو تھا مذاق۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک کام میں مجُھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

”میں حاضر ہوں۔ بے دھڑک کہو۔“ انتونیو اُٹھتے ہوئے بولا۔

گیپتو نے کہا۔ ”بے کار پھرتے پھرتے آدھی عُمر بیت گئی۔ سوچتے سوچتے آج ایک بڑی اچھّی ترکیب دماغ میں آئی ہے۔ اگر میں کٹھ پتلیاں بنا کر گاؤں گاؤں، قصبے قصبے پِھروں اور لوگوں کو ان کا تماشا دِکھاؤں تو کافی پیسے کما سکتا ہوں۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بڑا اچھّا خیال ہے۔ ماموں کریلا!“ ایک ننّھی سی آواز آئی۔

کریلے کا نام سُنتے ہی گیپتو کا چہرہ چقندر کی طرح سُرخ ہو گیا، ڈاڑھی تھر تھر کانپنے لگی اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ وہ بڑھئی کی گردن دبوچ کر غصّے سے بولا۔ ”کیوں بے بڑھئی کے بچّے! تیری یہ مجال! تو نے مُجھے ماموں کریلا کہا؟“

”ارے بابا! میں نے کب کہا؟“ انتونیو گھبرا کر بولا۔

”میں بہرا نہیں۔ میں نے خود سُنا۔“

”میں نے نہیں کہا۔“

”تو نے کہا۔“

”نہیں کہا۔“

”کہا۔“

پہلے توتُو تُو مَیں مَیں ہوتی رہی اور پھر مار کُٹائی تک نوبت پہنچ گئی۔ گھونسے مار مار کر دونوں نے ایک دوسرے کا مُنہ سُجا دیا۔ آخر جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔

”توبہ توبہ! ہم بھی کتنے احمق ہیں! بِن بات لڑ پڑے۔“ گیپتو بولا۔ ”مُمکن ہے میرے کانوں نے مجُھے دھوکا دیا ہو۔“

”تو اور کیا۔“ انتونیو نے کہا۔ ”بھلا میں ایسی نامعقول بات کہہ سکتا ہوں؟

آؤ ہاتھ ملا لیں۔"

دونوں نے ہاتھ ملائے اور وعدہ کیا کہ پھر کبھی زندگی بھر نہیں لڑیں گے۔

"ہاں تو وہ بات کیا تھی؟ بھائی گپیتو!" انتونیو نے پوچھا۔

"مجھے تھوڑی سی لکڑی کی ضرورت ہے کٹھ پُتلیاں بنانے کے لیے۔" گپیتو نے کہا۔ "اگر تُم دے سکو تو مہربانی ہو گی۔"

"ارے میاں! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔" انتونیو نے کہا اور جلدی سے وہ لکڑی اُٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی جس کے متعلّق اس کا خیال تھا کہ اس میں کوئی جِن چھُپا ہوا ہے۔

"ایسی عجیب و غریب لکڑی تمہیں دُنیا کے تختے پر نہیں ملے گی۔" انتونیو نے کہا۔ "ابھی تو یہی لے جاؤ کل پرسوں اور ڈھونڈ رکھوں گا۔"

گپیتو نے انتونیو کا شکریہ ادا کیا اور لکڑی لے کر گھر آ گیا۔

بے چارا گیپیتو ایک غریب آدمی تھا۔ چھوٹے سے گھر میں بالکل اکیلا رہتا تھا۔ نہ جورو، نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ گھر آ کر اُس نے چاقو تیز کیا اور اُس لکڑی سے کٹھ پتلی بنانے بیٹھا۔

"یہ لکڑی بہت سخت اور کھُردری ہے۔ اِس کا میں کٹھ پُتلا بناؤں گا۔" وہ دِل ہی دِل میں کہنے لگا۔ "مگر اُس کا نام کیا رکھوں! اوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ پِناکو۔۔۔ بس پِناکو ٹھیک رہے گا۔۔۔ یہ بہت برکت والا نام ہے۔ مُجھے یاد ہے اِس شہر میں ایک بہت مال دار آدمی رہا کرتا تھا۔ اس کا نام بھی پِناکو تھا۔"

سب سے پہلے اُس نے چاقو سے کٹھ پتلے کے بال بنائے، پھر سر اور اُس کے بعد آنکھیں۔ آنکھیں بننے کی دیر تھی کہ کٹھ پُتلے نے اُنہیں گھُما کر چاروں طرف دیکھا اور پھر گیپیتو کو گھورنے لگا۔

گپیتو ڈانٹ کر بولا۔ ''یہ اُلّوؤں کی طرح تُو مُجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہا ہے؟ نظریں نیچی کر۔ بڑوں کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالا کرتے۔'' کٹھ پُتلے نے آنکھیں بند کر لیں اور گپیتو پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اب گپیتو نے اُس کی ناک بنانا شروع کی لیکن وہ ابھی پوری بنی بھی نہیں تھی کہ وہ آپ ہی آپ بڑھنے لگی۔ گپیتو نے جلدی سے اُسے کاٹ ڈالا مگر جتنی کاٹتا اتنی ہی وہ اور بڑھ جاتی۔ آخر تھک ہار کر اُس نے ناک چھوڑ دی اور منہ بنانے لگا۔ ابھی منہ آدھا ہی بنا تھا کہ کٹھ پتلے نے زور کا قہقہہ

لگایا اور پھر طرح طرح کے مُنہ بنانے لگا۔

”عجیب بد تمیز بچّہ ہے!“ گپیتو نے جھلّا کر کہا۔ ”اگر اب کوئی بد تمیزی کی تو چپت مار کر مُنہ توڑ دوں گا۔“

مُنہ بنانے کے بعد اُس نے ٹھوڑی بنائی، پھر گردن، پھر کاندھے، پھر نیچے کا دھڑ اور اُس کے بعد بازو اور ہاتھ۔ جُونہی کٹھ پتلے کے ہاتھ بنے، اُس نے گپیتو کی ٹوپی اُتار کر اپنے سر پر رکھ لی اور لگا قہقہے لگانے۔

پناکو کی اِس گستاخی سے گپیتو کو بہت دُکھ ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”بیٹے! اگر مجُھے پتا ہوتا کہ تو ایسا نالائق ہو گا تو تُجھے ہر گز نہیں بناتا۔ خیر، اب جو خُدا کی مرضی۔“

اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر کام شروع کر دیا۔

اب صرف ٹانگیں اور پیر رہ گئے تھے۔ گپیتو نے وہ بھی منٹوں میں بنا

دیے۔ اِس کے بعد اُس نے کٹھ
پُتلے کو زمین پر کھڑا کیا اور ہاتھ
پکڑ کر اُسے چلنا سکھانے لگا۔
پہلے پہل تو پناکو کی ٹانگیں
لڑکھڑائیں اور دو تین بار وہ گر
بھی بڑا لیکن جلد ہی اُسے چلنا آ
گیا اور وہ سارے کمرے میں
دوڑنے لگا۔ اتّفاق سے دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک
زور کی قلانچ ماری اور دروازے میں سے نکل یہ جا وہ جا۔

"پکڑو۔ پکڑو۔ لینا۔ جانے نہ پائے۔" گیپتو چیختا چلّاتا اُس کے پیچھے دوڑا۔
راہ گیروں نے کاٹھ کے پُتلے کو سڑک پر دوڑتے دیکھا تو وہ ہنستے ہنستے
دوہرے ہو گئے اور اُنہوں نے گیپتو کے رونے دھونے کی طرف کوئی

دھیان نہ دیا۔ سامنے سے ایک پولیس والا آرہا تھا۔ وہ سمجھا کوئی بچھیرا رسّی تڑا کر بھاگ آیا ہے۔ اُس نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔

گپیتو بھی ہانپتا کانپتا آ پہنچا اور چیخ کر بولا۔ "شیطان! گھر چل۔۔۔ ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ عُمر بھر یاد رکھے گا۔ دوڑا دوڑا کر ہلکان کر دیا۔ توبہ! توبہ۔ ایسا نامعقول بچّہ خُدا کسی کو نہ دے۔"

یہ کہہ کر اُس نے پنا کو کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹا لیکن پنا کو مچل گیا اور زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کہنے لگا۔ "نہیں نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ میں گھر نہیں جاؤں گا۔ تُم مُجھے مارو گے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سا مجمع اکٹھّا ہو گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک شخص بولا۔ "ہائے! بے چارہ کٹھ پُتلا! ظالم نے کِس بُری طرح اسے مارا ہے۔"

دوسرا بولا۔ "میں نے خود دیکھا۔ یہ اُس کے لاتیں اور گھونسے مار رہا تھا۔"

لوگوں نے پنا کو کی حمایت میں اور گپیتو کے خلاف ایسے زمین آسمان کے قلابے ملائے کہ پولیس والے کو اِن کی باتوں کا یقین آگیا۔ اُس نے پنو کو کو تو دیا چھوڑ اور بے چارے گپیتو کو پکڑ کر تھانے لے گیا۔

۲
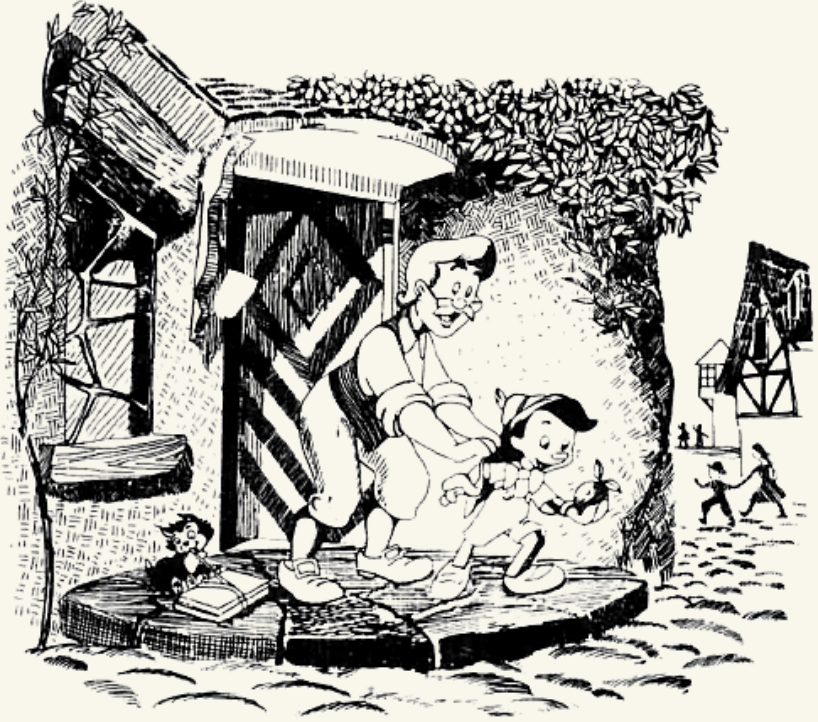
جب پولیس والا گیپیتو کو پکڑ کر لے گیا تو پنا کو بھاگم بھاگ گھر آیا۔ دروازے کی کُنڈی چڑھائی اور کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ”آہا! اب میں آزاد ہوں۔ جو چاہوں گا، کروں گا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں

اور۔۔۔"

ابھی وہ کُچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ کہیں سے آواز آئی: "کریک۔ کریک۔ کریک۔"

پناکو نے گردن گھُما کر دیکھا۔ سامنے دیوار پر ایک جھینگر بیٹھا اُسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

"تُم کون ہو؟" پناکو نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ایک بولتا جھینگر ہوں۔ سو سال سے اِس گھر میں رہ رہا ہوں۔"

"خیر۔ تُم سو سال سے رہ رہے ہو یا ہزار سال سے۔" پناکو نے کہا۔ "تمہاری خیریت اِسی میں ہے کہ دُم دبا کر چُپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ اب یہ گھر میرا ہے۔"

"میں اُس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تُم میری بات نہ سُن لو۔"

جھینگر بولا۔

”تو پھر جلدی سے کہہ دو۔۔۔“

”تُم نے اپنے باپ کو مُصیبت میں پھنسا کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ تمہیں اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

”جا جا۔۔۔! بڑا آیا نصیحت کرنے والا۔“ پنا کو جھڑک کر بولا۔ ”اِسے پکڑواتا نہیں تو کیا اپنی جان کو روگ لگاتا؟ دُنیا کے تمام باپ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں سوائے نصیحتیں کرنے، ڈانٹنے ڈپٹنے اور مارنے پیٹنے کے اور کُچھ نہیں آتا۔ گیپیتو بھی میرے ساتھ یہی کُچھ کرتا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مُجھے زبردستی اسکول بھیجتا۔ اسکول! اف کتنا ڈراؤنا نام ہے۔ اِس سے تو جیل خانہ اچھّا۔ مُجھے دُنیا کی کسی چیز سے اِتنی نفرت نہیں جتنی پڑھنے لکھنے سے ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ دِن بھر اِدھر اُدھر گھومتا

پھروں۔ پتنگیں اڑاؤں، کھیل تماشے دیکھوں، درختوں پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلے اُتاروں۔۔۔"

"لیکن ننّھے میاں!" جھینگر بولا۔ "اِن باتوں کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ تُم ابھی بچّے ہو۔ بڑے ہو گئے تو معلوم ہو گا کہ ماں باپ جو کرتے ہیں، اپنے بچّوں کی بھلائی ہی کے لیے کرتے ہیں۔"

"اچھّا! اب بکواس بند کرو۔" پنّاکو نے غصّے سے کہا۔ "اور بھاگو یہاں سے!"

"ہا! بے چارہ پنّاکو۔" جھینگر نے آہستہ سے کہا۔ مُجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے۔"

"رحم کیوں آتا ہے؟" پنّاکو نے پوچھا۔

"اِس لیے کہ ایک تو تُم بچّے ہو۔" جھینگر بولا۔ "اور دوسرے عقل کے

بالکل کچّے۔"

"پنّاکو جل بھُن کر کباب ہو گیا۔ اُس نے گیپتو کا ہتھوڑا اُٹھایا اور جھینگر کے سر پر اتنی زور سے مارا کہ بے چارے کے منہ سے چیں تک بھی نہیں نکلی۔

اب رات ہو گئی تھی اور پنّاکو کا بھُوک کے مارے بُرا حال تھا۔ صُبح سے کُچھ کھایا جو نہ تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کِسی کونے کھُدرے میں کھانے کی کوئی چیز مل جائے لیکن گھر میں تو جھاڑو پھِری ہوئی تھی۔ گیپتو غریب کا تو یہ حال تھا کہ روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینا۔ وہ اتنا ہی کماپاتا تھا کہ نہ باسی بچے اور نہ کُتّا کھائے۔

پنا کو نے بہت ڈھونڈا، بہت تلاش کیا مگر سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہ ملا۔ پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں اینٹھے جا رہے تھے، کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور حلق میں کانٹے سے چُبھ رہے تھے۔ یہ سب کُچھ اُس وقت ہوتا ہے جب پیٹ کھانے کے لیے مانگے۔ اُس سے اور کُچھ تو بن نہ پڑا، دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ لیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ ”ہائے اللہ! یہ میں نے کیا کِیا! جھینگر سچ کہتا تھا۔ یہ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اگر میرے ابّا یہاں ہوتے تو وہ مُجھے بھوکا نہ مرنے دیتے۔ اب میں مر جاؤں گا۔ بھوکا، پیاسا۔ اے پروردگار! میرا کوئی والی وارث نہیں۔ ارے لوگو! تُم ہی میری مدد کرو۔“

بھوکا انسان ذلیل سے ذلیل کام بھی کرنے کو تیّار ہو جاتا ہے۔ جب کوئی اور سبیل نظر نہ آئی تو پنا کو نے ایک بڑی گھٹیا درجے کی ترکیب سوچی، جسے کوئی خود دار اور شریف انسان گوارا نہیں کر سکتا۔ اس نے سوچا کسی

سے بھیک مانگوں۔ شاید کوئی اللہ کا بندہ ترس کھا کر کُچھ دے دے۔

وہ جاڑوں کی ایک بڑی ہی بھیانک رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے دِل دہلا جا رہا تھا۔ پنا کو نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ گلی بالکل سُنسان تھی۔ آدمی تو آدمی کوئی کُتّا تک نظر نہ آتا تھا۔ لوگ باگ شام ہی سے لحافوں میں دُبک کر سو گئے تھے۔ ایسا خوف ناک سماں دیکھ کر وہ سر سے پیر تک کانپ اُٹھا، مگر بھوک نے ہمّت بندھائی۔ وہ سکڑا سمٹا باہر نکلا اور پڑوسی کے دروازے کی کنڈی کھڑ کھڑائی۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے کھڑکی کھولی اور گردن باہر نکال کر بولا۔ ”کون ہے؟“

”بابا صُبح کا بھوکا ہوں۔“ پنا کو نے گِڑگِڑا کر کہا۔ ”خُدا کے لیے کُچھ کھانے

کو دو۔“

”ذرا ٹھہرو!“ اُس آدمی نے کہا اور واپس چلا گیا۔ ایک منٹ کے بعد وہ پھر آیا اور بولا۔ ”کھڑکی تلے آکر جھولی پھیلاؤ۔“

پنا کو کے پاس جھولی چھوڑ، ٹوپی تک نہ تھی۔ وہ کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”بابا! جھولی تو ہے نہیں۔ روٹی پھینک دو۔ میں ہاتھوں میں تھام لوں گا۔“

”اچھا، تو یہ لو!“ اُس آدمی نے کہا اور ٹھنڈے یخ پانی کا بھرا ہوا جگ اُس کے سر پر اوندھا دیا۔ ایک تو ویسے ہی سردی کڑاکے کی تھی، اوپر سے برف جیسا پانی پڑا تو پنا کو کی قُلفی جم گئی۔ اُس نے سوچا کہ جب اُس بھلے مانس نے ایسا سلوک کیا تو دوسرے بھی ایسا ہی کریں گے۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر چلے چلو۔ جو قسمت کو منظور

ہے وہ ہو کر رہے گا۔ وہ روتا پیٹتا گھر آیا اور فرش پر لیٹ کر سو گیا۔

صُبح کے وقت کسی نے زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ پنّا کو کی آنکھ کھُل گئی لیکن بھوک کی وجہ سے کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُٹھا تک نہ گیا۔ اُس نے لیٹے ہی لیٹے پوچھا:

"کون ہے؟"

"میں ہوں بیٹے! دروازہ کھولو۔" یہ گپیتو کی آواز تھی۔

"ابّا! میرے پیارے ابّا!" پنّا کو خوشی سے چلاتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھول کر گپیتو سے لپٹ گیا۔ "خُدا کا شکر ہے تُم آ گئے۔ ورنہ میں تو بھوک سے مر چلا تھا۔ کل صُبح سے ایک کھیل بھی اُڑ کر مُنہ میں نہیں گئی۔ پیارے ابّا! تمہارے پاس کُچھ کھانے کو ہے؟"

گپیتو نے جیب سے تین ناشپاتیاں نکالیں اور بولا۔ "یہ ناشپاتیاں میں نے

اپنے ناشتے کے لیے خریدی تھیں۔ پر اب تُم کھالو۔ اگرچہ تُم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اُس کی وجہ سے تُم میری ہمدردی کے مستحق تو نہیں۔"

"چھوٹوں کا کام ہے خطا کرنا۔" پنا کو نے ناشپاتی کھاتے ہوئے کہا۔ "اور بڑوں کا کام ہے معاف کر دینا۔ مُجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے تکلیف اُٹھانا پڑی۔ مُجھے یقین تھا کہ تھانے والے تمہیں کُچھ نہیں کہیں گے اور ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیں گے۔ اب میں نے عہد کیا ہے کہ گھر سے کبھی نہیں بھاگوں گا۔ روز اسکول جایا کروں گا اور خوب جی لگا کر پڑھوں گا۔"

وہ اتنا بھوکا تھا کہ منٹوں میں تینوں ناشپاتیاں چٹ کر گیا اور بے چارے گپیتو سے جھوٹوں بھی نہ پوچھا کہ لو۔۔۔ تھوڑی سی تُم بھی کھالو۔ پھر اُس نے زور کی ڈکار لی اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "یہ بھوک بھی کم بخت

کتنی بُری بلا ہوتی ہے، میری توبہ! اب تو میں زندگی بھر بھی گھر سے قدم باہر نہ رکھوں گا۔“

”لیکن تم اسکول تو جایا کرو گے نا؟“ گیپیتو نے پوچھا۔

”ہاں ہاں!“ پنا کو بولا۔ ”مگر میرے پاس کپڑے تو ہیں نہیں؟“

گیپیتو سوچ میں پڑ گیا۔ اُس غریب کی اِتنی بساط کہاں تھی کہ وہ پنا کو کو نئے کپڑے خرید کر دیتا۔ اُس نے اپنے پھٹے، پرانے کپڑے جمع کیے اور اُنہیں جوڑ جاڑ کر ایک جوڑا سی دیا۔
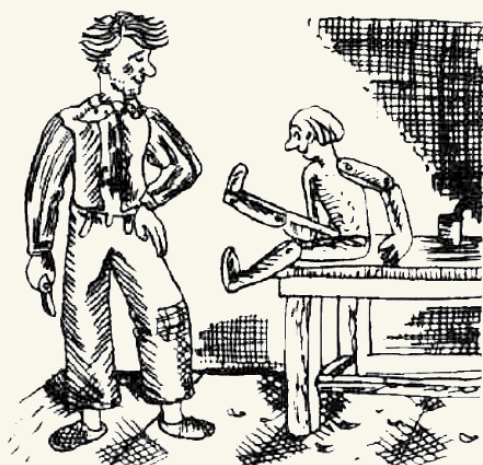
”آہا!“ پنا کو کپڑے پہن کر بولا۔ ”اِن کپڑوں میں تو جنٹلمین لگتا ہوں مگر اسکول میں پڑھوں گا کیا؟ کتاب تو ہے نہیں۔“

”کتاب! کتاب کہاں سے لاؤں بیٹے؟“ گیپتو نے کہا۔

”دُکان سے۔“

”اور پیسے؟“

”میں کیا بتاؤں؟“ پنا کو نے بے پروائی سے کہا۔

”ذرا ٹھہرو۔“ گیپتو سوچتے ہوئے بولا۔ پھر اُس نے اپنا پھٹا پرانا کوٹ کاندھے پر ڈالا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سی کتاب تھی مگر کوٹ غائب تھا۔

”کوٹ کہاں گیا ابّا؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”بیچ ڈالا۔“

”کیوں! اتنی تو سردی پڑ رہی ہے۔ اب تُم پہنو گے کیا؟“

”وہ کوٹ گرم بہت تھا بیٹے۔“گپیتو بولا۔ ”اُسے پہن کر پسینہ آ جاتا تھا۔
یہ قمیص ہی کافی ہے۔“

پنّاکو سمجھ گیا کہ گپیتو نے کوٹ بیچ کر اُس کے لیے کتاب خریدی ہے۔
اُس نے محبّت سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولا۔ ”میرے
پیارے ابّا! جب میں پڑھ لکھ کر نوکر ہو جاؤں گا تو تمھیں ایک نیا کوٹ
خرید دوں گا۔“

دوسرے دِن صُبح ہی صُبح گپیتو
نے پنّاکو کا مُنہ دھلا، کپڑے
پہنائے اور ناشتا کرا کے بولا۔
”لو بیٹا! اب اسکول سدھارو۔
مگر دیکھو۔ سیدھے جانا اور
سیدھے آنا۔ شاباش!“

پنا کو نے کتاب بغل میں دابی اور اسکول کی طرف چل دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ اس کے کانوں میں بینڈ باجے کی آواز آئی۔ اس نے سوچا ابھی تو کافی وقت ہے۔ کُچھ دیر باجا سُن لوں، پھر اسکول چلا جاؤں گا۔ وہ سیدھا اُس طرف چلا جدھر سے باجے کی آواز آ رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک میدان میں تنبو، قناتیں لگی ہوئی تھیں اور اُن کے آگے بہت سے لوگ جمع تھے۔ باجا یہیں بج رہا تھا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" پنا کو نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"تُم خود پڑھ لو۔ وہ دیکھو، سامنے بورڈ لگا ہوا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"پڑھا ہوا ہوتا تو تُم سے کیوں پوچھتا؟"

"یہ تھیٹر ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "یہاں کٹھ پُتلیوں کا تماشا دکھایا جاتا ہے۔"

”اچھّا!“ پنا کو ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ تماشے کا نام سُن کر اُس کی نیّت بدل گئی۔

”کتنے کا ٹکٹ ہے؟“

”چار آنے کا۔۔۔“

”یار! ایک مہربانی کرو۔“ پنا کو نے اُس کی خوشامد کی۔ ”ایک چونّی اُدھار دے دو۔ کل دے دوں گا۔“

”میں کوئی ساہوکار ہوں۔“ لڑکے نے جھڑک کر کہا۔

”اچھّا، اُدھار نہیں دیتے تو میرا یہ کوٹ لے لو۔“

”اِن پھٹے چیتھڑوں کے چار آنے کون دے گا؟“

پنا کو یہ سُن کر مایوس ہو گیا۔ یکایک اُس کی نظر اپنی کتاب پر پڑی اور اُس کے چہرے پر اُمّید کی کرن کوند گئی۔ بولا۔ ” دیکھو! یہ کتاب لے لو۔

بالکل نئی ہے۔"

"بچّوں کی کتابیں خریدنا بُری بات ہے۔" لڑکے نے کہا۔

مجمع میں ایک پرانی کتابیں بیچنے والا بھی کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور بولا۔ "لاؤ، مُجھے یہ کتاب دے دو۔ یہ لو چونّی۔"

پنا کو نے کتاب اُسے دے دی اور ٹکٹ خرید کر تھیٹر کے اندر چلا گیا۔

اُدھر گیپیتو بے چارہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا کیونکہ اُس نے کوٹ بیچ کر اپنے پیارے بیٹے کے لیے کتاب خریدی تھی اور اُس کا پیارا بیٹا کتاب بیچ کر کٹھ پُتلیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

۳

جب پنا کو تھیٹر کے اندر داخل ہوا تو کھیل شروع ہو گیا تھا۔ اسٹیج پر دو کٹھ پُتلیاں آپس میں لڑ رہی تھیں اور تماشائی ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بنے جا رہے تھے۔ یکا یک ایک کٹھ پُتلی کی نظر پنا کو پر پڑی اور وہ چلّا کر بولی۔ ”ارے!

وہ کون ہے؟ کہیں پنا کو تو نہیں؟"

دوسری کٹھ پُتلی نے بھی پنا کو کی طرف دیکھا اور زور سے بولی۔ "آہا! یہ تو پنا کو ہے۔۔۔پنا کو بھائی۔۔۔او پنا کو بھائی!"

اُن کی چیخیں سُن کر دوسری کٹھ پُتلیاں اور کٹھ پُتلے بھی پردے کے پیچھے سے نکل آئے اور "پنا کو۔ پنا کو" کے نعرے لگا کر سارا تھیٹر سر پر اُٹھالیا۔ پنا کو نے اپنا ایسا پُر جوش استقبال ہوتے دیکھا تو مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو گیا۔ تماشائیوں کو اُلانگتا، پھلانگتا اسٹیج پر چڑھ گیا اور ایک ایک کٹھ پُتلی سے خوب خوب گلے ملا۔

اسٹیج پر ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ سارا کھیل چوپٹ ہو گیا تھا۔ تماشائیوں نے یہ دیکھا تو لگے غُل مچانے۔ "کھیل شروع کرو یا ہمارے دام واپس کرو۔ یہ کیا گڑبڑ ہے!"

یہ غُل غپاڑہ سُن کر تھیٹر کا منیجر جلدی سے باہر آیا اور اس نے ایک نئے کٹھ پتلے کو اسٹیج پر دیکھا تو سمجھا کہ یہ ساری گڑبڑ اِسی کی پھیلائی ہوئی ہے۔

تھیٹر کا منیجر بڑا لمبا تڑنگا، موٹا تازا اور بد صورت آدمی تھا۔ اُس کی داڑھی اتنی بڑی تھی کہ جب چلتا تو وہ زمیں پر گھسٹتی۔ اُس کی ڈراؤنی شکل دیکھ کر بچّے تو بچّے، بڑے بھی ڈر جاتے تھے۔ اُس نے آتے ہی پنا کو کا کان پکڑ کر اُسے اوپر اُٹھا لیا اور چپت مار کر بولا۔ ”کیوں بے! کون ہے تو اور یہاں کیوں اودھم مچا رہا ہے؟“

پنا کو مارے درد کے بِلبِلا اُٹھا اور رو کر بولا۔ ”قسم لے لیجئے۔ میں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ میں تو تماشا دیکھنے۔۔۔“

”اچھّا، اچھّا! بکواس بند کر۔ کھیل ختم ہونے کے بعد میں تُجھے مزا چکھاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے پنا کو کو دیوار میں لگی ہوئی ایک کھونٹی سے ٹانگ

دیا۔

تماشا ختم ہونے کے بعد منیجر باورچی خانے میں گیا اور کھانا پکانے لگا۔ اتّفاق سے ایندھن کم تھا۔ اس نے اپنی کٹھ پُتلیوں کو حکم دیا۔ ”جاؤ! باہر برآمدے میں ایک کٹھ پُتلا ٹنگا ہوا ہے، اُسے لے آؤ۔ اُس کی لکڑی سے ہنڈیا اچھّی پکے گی۔“

کٹھ پُتلیاں پہلے تو ہچکچائیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اُن کا ایک بھائی چولھے میں جلایا جائے مگر جب اُنہوں نے اپنے مالک کی لال لال آنکھیں دیکھیں تو بگٹٹ بھاگیں اور پنا کو پکڑ کر لے آئیں۔

پنا کو مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا اور رو رو کر کہہ رہا تھا۔ ”ہائے ابّا! مُجھے بچاؤ! میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔“

منیجر صورت کا برا تھا، دِل کا اتنا بُرا نہ تھا۔ اُس نے پنا کو کو بِلکتے دیکھا تو اُسے

رحم آگیا۔ اور جب اسے رحم آتا تھا تو زور کی چھینک آتی تھی۔ یہ اس کی ایک خاص نشانی تھی۔ اس دفعہ بھی اسے چھینک آئی۔ ”آخ، چھیں۔۔۔“ اور چھینکنے کے بعد وہ بولا۔ ”الحمدللہ!“

پنا کو نے جھٹ جواب دیا۔ ”یرحمک اللہ (خُدا تُم پر رحم کرے)“

منیجر خوش ہو گیا اور نرمی سے بولا۔ ”بڑے تمیز دار بچّے معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟“

”جی! ماں تو کوئی نہیں۔ باپ ہے۔“

”کیا نام ہے اُن کا؟“

”جی، گپیتو۔۔۔“

”کیا کرتے ہیں وہ؟“

”محنت مزدوری۔“

”گزر بسر کیسی ہوتی ہے؟“

”صُبح کو کھاتے ہیں تو شام کی فکر پڑتی ہے۔ اُنہوں نے اپنا پھٹا پُرانا کوٹ بیچ کر میرے لیے کتاب خریدی تھی تاکہ میں اسکول جاؤں۔“

”اور تُم نے وہ کتاب بیچ کر کٹھ پُتلیوں کا تماشا دیکھ لیا۔ نالائق!“ منیجر کو غصّہ آگیا اور اس کی صورت ڈراؤنی ہو گئی۔

”میری بات تو سُنیے۔“ پنا کو جلدی سے بولا۔ ”اب میں نے توبہ کرلی ہے اور عہد کیا ہے کہ کبھی ایسی حرکت نہ کروں گا۔ ہمیشہ اپنے پیارے باپ

کا کہامانوں گا اور نیک لڑکوں کی طرح روز اسکول جایا کروں گا۔"

"ہائے! بے چارہ گپیتو۔" منیجر سر ہلا کر بولا۔ "باپ ایسا شریف اور بٹیا ایسا کمینہ! جی تو چاہتا ہے کہ تیری بوٹیاں نوچ کر چیل کوّوں کو کھلا دوں، مگر خیر، اس دفعہ معاف کرتا ہوں۔ یہ لے پانچ اشرفیاں۔ سونے کی ہیں۔ گھر جا کر باپ کو دے دینا۔"

پناکو نے اشرفیاں جیب میں ڈالیں، منیجر کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ ایک لومڑی اور ایک بلّی ملی۔ لومڑی لنگڑی تھی اور بلّی اندھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھیں۔ پناکو ان کے پاس سے گزرا تو لومڑی ہوئی:

"السّلام علیکم! میاں پناکو!"

"ارے! تمہیں کیسے معلوم کہ میرا نام پناکو ہے؟"

”میں تمہارے باپ کو خوب اچھّی طرح جانتی ہوں۔“ لومڑی نے جواب دیا۔

”تُم نے اُنہیں کہاں دیکھا تھا؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”کل وہ اپنے گھر کے دروازے میں بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔“ لومڑی نے کہا۔ ”پتا نہیں، اُس کا کوٹ کہاں گیا؟“

”وہ کوٹ؟۔۔۔ وہ کوٹ۔“ پنا کو تھوک نِگل کر بولا۔ ”اُن کا کوٹ کھو گیا ہے، لیکن کوئی پروا نہیں۔ میں اُنہیں نیا کوٹ بنوا دوں گا۔ اب میں ایک امیر آدمی ہوں۔“

”امیر آدمی۔۔۔!“ لومڑی نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

”اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ پنا کو غصّے سے بولا۔ ”میں جھوٹ تو نہیں کہتا۔ یہ دیکھو، یہ اشرفیاں سونے کی ہیں۔“ اُس نے اشرفیاں نکال کر

لومڑی کو دِکھائیں۔ اشرفیاں دیکھ کر لومڑی اُچھل پڑی۔ بلّی نے بھی مارے حیرت کے دونوں آنکھیں پھاڑ دیں مگر پھر جلدی سے میچ لیں تاکہ پنا کو نہ دیکھے۔ اصل میں یہ دونوں ٹھگ اور دھوکے باز تھیں اور بھولے بھالے لوگوں کو لوٹنے کے لیے اُنہوں نے یہ سوانگ رچایا تھا۔

”تُم اِن اشرفیوں کا کیا کرو گے؟“ لومڑی نے پوچھا۔

”سب سے پہلے تو میں اپنے پیارے ابّا کے لیے ایک بڑھیا سا کوٹ خریدوں گا اور پھر اپنے لیے ایک کتاب۔۔۔!“

”کتاب کا کیا کرو گے؟“ لومڑی نے پوچھا۔

”اسکول جایا کروں گا۔“

”ارے رے رے! اسکول بھول کر بھی نہ جانا۔“ لومڑی کانوں پر ہاتھ دھر کے بولی۔ ”ماسٹر لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ میری ٹانگ ایک

ماسٹر ہی نے توڑی تھی۔"

"اور میری آنکھیں پھوڑ دی تھیں۔" بلّی نے کہا۔

"لیکن پڑھنے لکھنے ہی سے تو آدمی بڑا بنتا ہے۔" پنا کو بولا۔

"آدمی صرف دولت سے بڑا بنتا ہے۔" لومڑی نے کہا۔ "اگر تمہارے پاس چار پیسے ہیں تو لوگ تمہاری عزّت کریں گے، تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ پیسے نہیں تو چاہے تم کتنے ہی پڑھے لکھے ہو، کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

"بی لومڑی! بالکل سچ کہتی ہیں۔" بلّی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "اور وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ آدمی دولت مند کس طرح بن سکتا ہے۔"

"کس طرح بن سکتا ہے؟" پنا کو نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھے رقم کو دوگنا، چوگنا بلکہ ہزار گنا کرنے کی ترکیب معلوم ہے۔"

لومڑی نے کہا۔ ”تمہاری پانچ اشرفی پانچ ہزار اشرفیاں بن سکتی ہیں۔“

”کیسے۔۔۔؟“ پنّاکو بولا۔ اُس کا دِل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”بڑی آسانی سے۔“ لومڑی نے کہا۔ ”تُم گھر جانے کے بجائے ہمارے ساتھ چلو۔“

پنّاکو نے کُچھ دیر سوچا اور پھر بولا۔ ”نہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میرے ابّا میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ میں سیدھا اُن کے پاس جاؤں گا اور یہ اشرفیاں اُنہیں دے دوں گا۔“

”تمہاری مرضی۔“ لومڑی بولی۔ ”مگر ایک بات یاد رکھو۔ تُم گھر آئی لکشمی کو لات مار رہے ہو۔ ایسے موقعے بار بار

نہیں آیا کرتے۔ یہ تو تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تمہیں مل گئیں۔"

"ایک دفعہ پھر سوچ لو۔" بلّی بولی۔ "تمہاری پانچ اشرفیاں، پانچ ہزار بن سکتی ہیں۔"

"لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟" پنا کو نے کہا۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں۔" لومڑی بولی۔ "یہاں سے تھوڑی دور ایک جادُو نگری ہے۔ وہاں جا کر ایک چھوٹا سا گڑھا کھودنا اور اس میں ایک اشرفی دبا دینا۔ پھر اُس پر تھوڑا سا نمک چھڑک کر پانی ڈال دینا۔ صُبح کو تم سو کر اُٹھو گے تو اُس جگہ ایک بڑا سا درخت کھڑا ہو گا جس میں ایک ہزار اشرفیاں لگی ہوں گی۔"

"اف! میرے اللہ! سچ مچ؟" پنا کو خوشی سے چلّا کر بولا۔

"بی لومڑی کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔" بلّی نے کہا۔

”اور اگر میں پانچوں اشرفیاں دبا دوں تو؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”تو پانچ درخت اُگ آئیں گے اور ہر درخت میں ایک ایک ہزار اشرفیاں لگی ہوں گی۔“

”ایسا ہوا تو میں ایک ہزار اشرفیاں تمہیں دے دوں گا۔“ پنا کو بولا۔

”توبہ! توبہ! ایسی بات پھر کبھی منہ سے نہ نکالنا۔“ لومڑی نے کہا۔ ”ہم خود غرض نہیں۔ ہم بغیر کسی لالچ کے دوسروں کا کام کرتے ہیں۔“

”کتنے اچھّے لوگ ہیں یہ!“ پنا کو نے دِل میں سوچا۔ ”دولت کے لالچ میں نہ اُسے اپنا باپ یاد رہا، نہ اس کا کوٹ اور نہ اپنی کتاب۔ اس نے خوشی سے تھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھّی بی لومڑی! مُجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں جادُو نگری ضرور جاؤں گا۔“

”ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔۔۔“ لومڑی بولی۔

۴

چلتے چلتے رات ہو گئی مگر جادُو نگری نہیں آئی۔ پنا کو تھک کر چُور ہو گیا تھا اور اُس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔

کُچھ دور آگے بڑھے تو ایک سرائے دِکھائی دی۔ لومڑی بولی۔ ”آؤ، تھوڑی دیر یہاں ٹھہر جائیں۔ کُچھ کھاپی لیں، آرام کریں، پھر آگے چلیں گے۔“

سرائے کا مالک لومڑی اور بلّی کا واقف تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر مُسکرایا اور آہستہ سے بولا: ”مُرغی تو موٹی معلوم ہوتی ہے۔ کہاں سے پھانس لائے؟“

لومڑی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر زور سے بولی۔ ”بھئی! کُچھ کھانے کو ہو تو لاؤ اور تین چارپائیوں پر صاف سُتھرے بستر بھی بچھوا دو۔ کھانے کے بعد کُچھ دیر آرام کریں گے۔“

”بہت اچھّا، سرکار!“ سرائے کے مالک نے کہا۔

”اور ہاں!“ لومڑی نے کہا۔ ”ٹھیک بارہ بجے اُٹھا دینا۔ ہمیں ایک ضروری

کام سے جانا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لومڑی اور بلّی کئی ہفتوں کی بھوکی ہیں۔ اِدھر سرائے کا مالک پلیٹ لا کر رکھتا اور اُدھر وہ صاف کر دیتیں۔ خُدا خُدا کر کے اُن کا پیٹ بھرا اور وہ توند پر ہاتھ پھیرتی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئیں۔

اس رات پنا کو نے ایک بڑا ہی سہانا سپنا دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ جادُو نگری میں ہے۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے درخت کھڑے جھُوم رہے ہیں اور اُن کی ٹہنیوں پر لاکھوں، کروڑوں اشرفیاں لگی ہیں۔ جب ہوا چلتی اور ٹہنیاں ہلتیں تو اشرفیاں کھن کھنا اُٹھتیں۔ پنا کو مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر درخت کی طرف بڑھا مگر ابھی اُس نے درخت کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ کسی نے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔

"بارہ بج گئے۔ جاؤ گے نہیں؟" سرائے کا مالک کہہ رہا تھا۔

"اچھّا!" پنا کو نے انگڑائی لی اور اُس طرف دیکھا جہاں لومڑی اور بلّی سونے لیٹی تھیں مگر وہ جگہ خالی تھی۔

"میرے ساتھی کہاں گئے؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ تو کبھی کے چلے گئے۔" سرائے کے مالک نے جواب دیا۔

"چلے گئے۔۔۔؟" پنا کو حیرت سے بولا۔ "مگر اُنہیں تو میرے ساتھ جانا تھا۔"

"بلّی کے گھر سے پیغام آیا تھا کہ اُس کا بچّہ سخت بیمار ہے۔" سرائے کے مالک نے کہا۔

"کھانے کے پیسے دے گئے ہیں؟" پنا کو نے پوچھا۔

"اُنہوں نے کہا تھا، ہم پنا کو

صاحب کے مہمان ہیں۔ کھانے کے پیسے وہی دیں گے۔"

"ہوں۔۔۔" پنا کو سوچتے ہوئے بولا۔ "اُنہوں نے مُجھے کہاں ملنے کو کہا تھا؟"

"جادُو نگری میں۔" سرائے کے مالک نے کہا۔ "آپ اِسی وقت روانہ ہو جایئے۔ اور ہاں! کھانے اور ٹھہرنے کا کرایہ ایک اشرفی بنتا ہے۔"

پنا کو نے اُسے اشرفی دی اور باہر نکل آیا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ ہوا ایسی سائیں سائیں کر رہی تھی کہ دِل دہلا جاتا تھا۔ وہ تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ ایک جھاڑی کی ٹہنی پر ایک ننھا سا کیڑا دِکھائی دیا۔ اُس کے جسم میں سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔ پنا کو ایک دم ٹھہر گیا اور بولا۔ "تُم کون ہے۔۔۔؟"

"میں اِس جھینگر کا بھُوت ہوں، جسے تُم نے مار ڈالا تھا۔" کیڑے نے

جواب دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دُور، بہت دُور، کسی دوسری دُنیا سے بول رہا ہے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" پنا کو نے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے باپ کے گھر واپس چلے جاؤ۔ وہ بہت دُکھی ہے اور ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہے۔"

"کل وہ دُنیا کا ایک امیر آدمی ہو گا۔" پنا کو نے کہا۔ "یہ جو میرے پاس چار اشرفیاں ہیں، صُبح تک چار ہزار بن جائیں گی۔"

"میرے بچّے!" جھینگر کے بھُوت نے کہا۔ "ایسے آدمی کا کبھی یقین نہ کرو جو تمہیں راتوں رات امیر بنانے کا وعدہ کرے۔ یہ لوگ دھوکے باز ہوتے ہیں۔ میری مانو۔ واپس چلے جاؤ۔"

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

”یاد رکھو! جو بچّے بزرگوں کی نصیحت نہیں مانتے اور من مانی کرتے ہیں، آخرکار وہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔“

”اونہہ! وہی پرانی کہانی۔“ پنا کو نے ناک چڑھا کر کہا۔ ”مجُھے جلدی ہے۔۔۔خُدا حافظ!“

”خُدا تمہیں اِن ٹھگوں سے محفوظ رکھے۔“ جھینگر نے کہا اور غائب ہو گیا۔

پنا کو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اشرفیوں کو چھُوا اور پھر آگے چل پڑا۔ چند قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک آواز آئی۔ ”پنا کو! اِدھر آؤ۔۔۔ ہم یہاں ہیں۔“

وہ جلدی سے آواز کی سمت بڑھا۔ ایک جھاڑی کے پاس لومڑی اور بلّی کھڑی تھیں۔ پنا کو نے پوچھا۔ ”تُم مجُھے چھوڑ کر کیوں چلی آئی تھیں؟“

”اس میں ایک مصلحت تھی۔“ لومڑی بولی۔ ”سرائے کے مالک کو پتا

چل گیا تھا کہ ہم جادُو نگری جا رہے ہیں۔ وہ سر تھا کہ ہم اُسے بھی لے کر چلیں۔ بڑی مشکل سے اُسے جل دے کر وہاں سے بھاگے۔"

"اِس اندھیری رات میں تو میرا دِل ہول کھا رہا ہے۔" پنا کو نے کہا۔ "جادُو نگری کتنی دُور ہے؟"

"بس تھوڑی ہی دُور ہے۔" لومڑی نے کہا۔ "آدھے گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ تُم وہاں کسی جگہ گڑھا کھود کر اپنی چاروں اشرفیاں دبا دینا۔ چند منٹ میں ایک درخت اُگ آئے گا جس میں چار ہزار اشرفیاں لگی ہوں گی۔"

"آؤ، پھر جلدی چلیں۔" پنا کو نے کہا۔ "مُجھے گھر بھی جانا ہے۔"

کُچھ دُور چل کر ایک چھوٹا سا شہر آیا۔ لومڑی اور بلّی ایک ویران سے کھیت کے پاس ٹھہر گئیں۔

”یہ جادُو نگری ہے۔“لومڑی نے کہا۔”اِس کھیت میں تُم اپنی اشرفیاں دبا دو۔“

پِناکو نے کھیت میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا اور اُس میں اشرفیاں ڈال کر پھر اُسے مٹّی سے بھر دیا۔

”سامنے ایک تالاب ہے۔“لومڑی نے کہا۔”تھوڑا سا پانی لا کر اِس پر چھِڑک دو۔“

پِناکو جلدی سے چُلّو میں پانی لایا اور گڑھے پر چھِڑک دیا۔

”شاباش!“لومڑی بولی۔”اب تُم شہر میں چلے جاؤ اور ایک ہزار تک گنتی گنو۔ جب ہزار پورے ہو جائیں تو یہاں آ جانا۔ اِس جگہ ایک چھوٹا سا درخت کھڑا ہو گا جس میں چار ہزار اشرفیاں لگی ہوں گی۔“

پِناکو نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ ایک ہزار اشرفیاں اُنہیں بھی

دے گا۔

”نہ نہ، ہمیں تمہارا روپیہ نہیں چاہیے۔“لومڑی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خُدا کے نیک بندے اپنی خدمت کا صلہ نہیں لیتے۔ ہمیں خُدا جنّت میں اِس کا بدلہ دے گا۔“

پناکو نے دونوں سے ہاتھ ملائے اور دِل ہی دِل میں خوش ہوتا شہر کی طرف چلا گیا۔

شہر میں جا کر وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا اور گِنتی گِننے لگا۔ جب وہ ہزار پر پہنچا تو جلدی سے اُٹھا اور اُس کھیت کی طرف دوڑا جس میں اُس نے اپنی اشرفیاں گاڑی تھیں۔ اُس کا دِل دھک دھک کر رہا تھا اور گال خوشی سے تمتما رہے تھے۔

”کاش، درخت میں چار ہزار کے بجائے پانچ ہزار اشرفیاں لگی ہوں۔“

اُس نے دِل میں سوچا۔ ”پھر میں ایک بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ میرا ایک خوب صورت محل ہو گا۔ نوکر چاکر ہوں گے۔ سیر سپاٹے کے لیے بگھّی ہو گی۔ جو چاہوں گا، کھاؤں گا اور جیسا چاہوں گا پہنوں گا۔“

وہ اسی طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا ہوا کھیت کے پاس پہنچا اور اشرفیوں سے لدا ہوا درخت تلاش کرنے لگا مگر وہاں کوئی بھی درخت نہ تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، دائیں بائیں، آگے پیچھے، مگر درخت ہوتا تو دِکھائی بھی دیتا۔ وہاں تو کوئی سوکھی ٹہنی تک نہ تھی۔

اچانک اُسے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے منڈیر پر ایک طوطا بیٹھا چونچ سے پَر کُرید رہا تھا۔

”تُم کیوں ہنس رہے ہو؟“ پنا کو نے ڈانٹ کر کہا۔

”جب میں کسی بے وقوف کو دیکھتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے۔“ طوطے نے

کہا۔ ”ارے احمق! کہیں درختوں پر بھی روپے لگے ہیں آج تک؟ پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا اور مُجھے اپنی اِس بے وقوفی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اب کہیں جا کر یہ پتا چلا کہ دولت یا تو ہاتھوں سے کمائی جا سکتی ہے یا دماغ سے۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔“ پنا کو نے کہا۔

”وہ لومڑی اور بلّی دھوکے باز تھیں۔ جب تُم اپنی اشرفیاں دبا کر چلے گئے تو اُنہوں نے گڑھا کھود کر اُنہیں نکال لیا اور بھاگ گئیں۔ اب تم انہیں کبھی نہیں پکڑ سکو گے۔“

پنا کو کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آیا کہ طوطا سچ کہہ رہا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے گڑھا کھودنا شروع کیا اور اس وقت تک کھودتا رہا جب تک کہ سخت مٹّی نہ آگئی۔ گڑھے میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔

رات تو اُس نے جُوں تُوں کر کے کاٹی۔ صُبح ہوئی تو روتا دھوتا شہر گیا اور کچہری میں جا کر جج سے فریاد کی۔ جج کو اُس کی بپتا سُن کر بہت دُکھ ہوا۔ وہ بولا۔ "تُم جیسے بے وقوف کا اِس طرح کھُلے بندوں پھِرنا ٹھیک نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پھِر کسی دھوکے باز کی چال کا نشانہ بن جاؤ اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مُصیبت میں ڈالو۔"

یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی بجائی۔ پولیس کے دو سپاہیوں نے آ کر سلوٹ کی۔ جج نے اُن سے کہا۔ "ہم حکم دیتے ہیں مسمیٰ پنا کو ولد گییتو کو جیل میں بند کر دیا جائے۔"

پنا کو بہتیرا رویا چلّایا، پیر پٹخے، چیخا مگر سپاہیوں نے ایک نہ سُنی اور اُسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

۵

پنا کو کو قید خانے میں چار مہینے ہی گُزرے تھے کہ اُس مُلک کا بادشاہ ایک مُلک فتح کر کے آیا۔ اِس خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منایا گیا اور بادشاہ نے تمام قیدیوں کو معافی دے دی۔ جو قیدی رہا ہوئے اُن میں پنا کو بھی

تھا۔

قید سے رہائی پا کر پنا کو کی خُوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دوبارہ زندگی پائی ہے۔ چار مہینے جیل کی مُصیبتیں جھیل کر اُس نے پکّا اِرادہ کر لیا تھا کہ اب وہ سیدھا گھر جائے گا اور باقی عُمر اپنے باپ کی خدمت میں گزار دے گا۔

چلتے چلتے شام ہو گئی مگر سڑک تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ صُبح سے کُچھ کھایا بھی نہ تھا۔ بھُوک کے مارے آنتیں قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اُس نے سوچا پہلے کُچھ کھالوں، پھر آگے چلوں گا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو دائیں طرف ایک باغ دِکھائی دیا۔ وہ جھَٹ باغ کی باڑ پھلانگ اندر گھُس گیا اور سیبوں سے لدے پھندے ایک درخت کی طرف بڑھا مگر قریب پہنچا ہی تھا کہ ”کھٹاک“ کی آواز آئی اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا پیر کسی شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ مارے درد کے اُس کے مُنہ

سے چیخ نکل گئی اور آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

وہ حیران پریشان بیٹھا رو رہا تھا کہ اتنے میں ایک جُگنو اُدھر سے گزرا۔ پناکو نے اُس کی خوشامد کی "میاں جُگنو! میرا پیر پھندے میں پھنس گیا ہے۔ خُدا کے لیے مُجھے اِس مُصیبت سے نجات دِلاؤ۔"

"لیکن تُم اِس پھندے میں پھنسے کیسے؟" جُگنو نے پوچھا۔

"میں اِس باغ میں پھل توڑنے آیا تھا۔"

"یہ پھل تمہارے ہیں؟"

"نہیں تو۔۔۔"

"پھر! تمہیں یہ کِس نے سِکھایا ہے کہ دوسروں کے باغ اُجاڑتے پھرو؟"

"میں بہت بھُوکا ہوں۔"

"بھوکا ہونا کوئی عُذر نہیں۔"

"یہ میں جانتا ہوں۔" پنا کو نے سِسکیاں لے کر کہا۔ "آیندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"

اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ باغ کا مالی ہاتھ میں لالٹین پکڑے آ رہا تھا۔ قریب آ کر اُس نے لالٹین اُوپر اٹھائی تو مارے حیرت کے اُچھل پڑا۔ اُس کا خیال تھا کہ پھندے میں کوئی جانور پھنسا ہو گا، مگر وہاں تو ایک لڑکا پھنسا پڑا تھا۔

"ہوں۔۔۔!" اُس نے غصّے سے کہا۔ "تو تم ہو وہ چور جو میری مُرغی کے چوزے چُرا کر لے جاتے تھے!"

"نہیں۔ نہیں" پنا کو نے چلّا کر کہا۔ "میں تو پھل توڑنے آیا تھا۔"

"جو شخص پھل چُرا سکتا ہے وہ چوزے بھی چرا سکتا ہے۔" مالی نے کہا۔

”میرے پیارے بچّے! میں تمہیں ایسا سبق دوں کہ عُمر بھر یاد رکھو گے۔“

اس نے پھندا کھول کر پناکو کی ٹانگ نکالی اور پھر اُسے گھسیٹتا ہوا اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔

”میرا کُتّا مر گیا ہے۔ آج رات اُس کی جگہ تُم چوکیداری کرو گے۔“ مالی نے کہا۔ ”کل صُبح میں سوچوں گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“

اس نے کُتّے کا پٹّا اور زنجیر نکالی اور پناکو کے گلے میں ڈال کر اُسے دروازے سے باندھ دیا۔

”خبر دار! اگر سوئے تو مُجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔۔۔ جُونہی کوئی کھٹکا سُنو، فوراً مُجھے جگا دینا۔“ یہ کہہ کر وہ سو گیا۔

کُچھ دیر بعد پناکو کو "پھُس پھُس" کی سی آواز آئی۔ اُس نے گردن گھُما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کُچھ فاصلے پر چار نیولے کھڑے تھے۔ ایک نیولا آہستہ آہستہ اُس کے قریب آیا اور بولا۔ "السّلام علیکم! میاں موتی!"

"میں موتی نہیں ہوں۔" پناکو نے کہا۔

"پھر کون ہو۔۔۔؟"

"میرا نام پناکو ہے۔"

"اور وہ کُتّا کہاں ہے جو روزانہ رات کو یہاں پہرا دیتا ہے؟"

"اُس کا آج صُبح انتقال ہو گیا۔"

"چچ چچ! بے چارہ موتی! کتنا اچھّا کُتّا تھا۔۔۔ خیر، صورت سے تُم بھی کوئی شریف کُتّے معلوم ہوتے ہو۔"

"معاف کیجیے۔ میں کُتّا نہیں ہوں۔"

”پھر کون ہو۔۔۔؟“

”ایک کٹھ پُتلا، جس نے اپنے باپ کا کہا نہ مانا اور اب اس کی سزا بھگت رہا ہے۔“

”خیر، تُم کوئی ہو، ہمیں اِس سے غرض نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ بھی ہمارا ویسا ہی سمجھوتا ہو جائے جیسا کہ موتی کے ساتھ ہوا تھا۔“

”کیسا سمجھوتا۔۔۔؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”ہم یہاں ہفتے میں ایک دفعہ آئیں گے اور پانچ چوزے لے جایا کریں گے۔ چار چوزے ہمارے اور ایک تمہارا۔۔۔ مگر ایک شرط ہے۔ جب تم ہمیں آتا دیکھو تو آنکھیں میچ کر پڑ جانا اور بھونکنا نہیں۔۔۔ کہو، منظور ہے؟“

"منظور ہے۔" پناکو نے کہا اور وہ آنکھیں بند کر کے اِس طرح لیٹ گیا جیسے سچ مچ سو رہا ہو۔

نیولے نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ مُرغیوں کا ڈربا کھول کر ایک ایک کر کے اندر گھُس گئے۔ اُن کے اندر داخل ہوتے ہی پناکو نے دروازہ بند کر کے ایک بڑا سا پتھّر اُس کے آگے رکھ دیا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ بھُوں اُوں اُوں.بھُوں اُوں اُوں۔"

اُس کی آواز سے مالی کی آنکھ کھُل گئی اور وہ ڈنڈا لے کر جلدی سے باہر آیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پناکو سے پوچھا۔

"میں نے چور پکڑ لیے ہیں۔" پناکو نے کہا۔ "مُرغیوں کے ڈربے میں بند

ہیں۔"

مالی نے جلدی سے ڈربا کھولا اور چاروں نیولوں کو پکڑ کر بوری میں بند کر دیا۔ پھر اُس نے پنا کو کی پیٹھ ٹھوکی اور بولا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ بدمعاش ڈربے میں گھُسے ہوئے ہیں؟ میرا موتی تو یہ بھید آج تک معلوم نہ کر سکا۔"

پنا کو کے دِل میں آیا کہ وہ موتی کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دے لیکن اُس نے سوچا کہ مرے ہوؤں کی بُرائی کرنا اچھّے لوگوں کا شیوہ نہیں۔ موتی نے جو کُچھ کیا، اس کا بدلہ اُسے خُدا دے گا۔ ہمارے گالیاں دینے اور بُرا بھلا کہنے کا اب کیا فائدہ!"

اُس نے جلدی سے بات بنائی۔ ”میں بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ ایک نیولا میرے پاس آیا اور بولا اگر تُم خاموش رہنے کا وعدہ کرو تو ایک چوزہ ہم تمھیں بھی دے دیں گے۔ میں نے جھُوٹ مُوٹ وعدہ کر لیا مگر جُونہی وہ اندر داخل ہوئے، بھونکنا شروع کر دیا۔“

”شاباش شاباش!“ مالی خوش ہو کر بولا۔ ”اب تُم آزاد ہو۔ صُبح ہوتے ہی جہاں مرضی چاہے چلے جانا۔“

اُس نے پنا کو کے گلے میں سے پٹّا اُتار دیا۔

دوسرے دِن سورج نکلنے سے پہلے ہی پنا کو وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ اب وہ اِس زندگی سے اتنا اُکتا گیا تھا کہ ایک ایک لمحہ اُس کے لیے بھاری تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کے پَر لگ جائیں اور وہ اُڑ کر اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے مگر سڑک اتنی لمبی تھی کہ خدائیوں پہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ چلتے

چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ چوٹی کا پسینا ایڑی تک آ گیا۔ آخر جب پاؤں میں بالکل ہی جان نہ رہی تو وہ لڑکھڑا کر ایک جگہ گِر گیا اور زور زور سے رونے لگا۔

عین اُس وقت ایک بڑا سا کبوتر اُڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

"لڑکے! تُم یہاں کیا کر رہے ہو؟" کبوتر نے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں، رو رہا ہوں۔" پنا کو نے رُوکھائی سے جواب دیا۔

"تُم پنا کو نامی کٹھ پُتلے کو جانتے ہو؟"

"پنا کو۔۔۔؟ یہ تو میرا نام ہے!" پنا کو نے کہا اور ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کبوتر اور قریب آ گیا اور بولا۔ "اگر تُم پنا کو ہو تو تُم گیپیتو کو بھی جانتے ہو

گے؟"

"جی ہاں! وہ میرے والد صاحب ہیں۔ مگر تُم انہیں کیسے جانتے ہو؟ وہ کہاں ہیں؟ مجُھے اُن کے پاس لے چلو۔ کیاوہ ابھی زندہ ہیں؟"

"تین دِن ہوئے، میں نے اُنہیں سمندر کے کنارے دیکھا تھا۔"

"وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"ایک کشتی بنارہے تھے۔ پانچ چھ مہینے سے بے چارہ بُوڑھا تمہیں ڈھونڈتا پھِر رہاہے۔ اب اُس نے سوچاہے کہ کشتی میں بیٹھ کر سمندر پار جائے اور کسی دوسرے ملک میں تلاش کرے۔"

"سمندر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"ایک ہزار میل۔۔۔"

"ہائے! ہائے! اگر میرے پَر ہوتے تو فوراً اُڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔"

”تُم جاناچاہو تو میں تمہیں لے جاسکتا ہوں۔“

”کِس طرح۔۔۔؟“

”میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔۔۔“

پناکو اُچھل کر کبوتر کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔

شام تک وہ اُڑتے رہے۔ رات ہوئی تو کبوتر ایک سُنسان سی جگہ اُتر گیا اور بولا۔ ”رات یہاں گزار کے صُبح چلیں گے۔“

پناکو نے کہا۔ ”مجُھے تو بھُوک لگی ہے اور پیاس بھی۔ کُچھ کھانے کو دو۔“

”اِس اندھیری رات میں تمہارے لیے کھانا کہاں سے لاؤں؟“ کبوتر نے کہا۔ ”صُبح تک صبر کرو!“

”مجُھ سے تو ایک منٹ بھی صبر نہیں کیا جائے گا۔“ پناکو بولا۔ ”اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ شاید کُچھ مل جائے۔“

اتّفاق سے پاس ہی ایک جنگلی بیری کا درخت تھا۔ اُس میں لال لال بیر لگے تھے۔ پنا کو منٹوں میں ساری بیری صاف کر گیا اور ڈکار لے کر بولا۔

"واہ واہ! کتنے میٹھے بیر تھے!"

"جنگلی بیریوں کے بیر اتنے کھٹّے ہوتے ہیں کہ پرندے بھی نہیں کھاتے۔" کبوتر نے کہا۔

"مگر مُجھے تو بہت مزے دار لگے۔" پنا کو نے کہا۔

"بھُوکے جو تھے۔ بھوک میں بدمزہ سے بدمزہ چیز بھی لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے: پیاس نہ دیکھے دھوبی گھاٹ، بھوک نہ دیکھے سوکھے پات۔"

رات اُنھوں نے وہیں ایک درخت کے سائے میں بسر کی اور صُبح ہوتے ہی پھر روانہ ہو گئے۔ شام کے وقت سمندر نظر آیا۔ کبوتر نے پنا کو کو نیچے

اُتار دیا اور بولا۔ ”وہ سامنے ساحل دِکھائی دے رہا ہے۔ وہ۔۔۔ جہاں لوگ کھڑے ہیں۔ جلدی سے جاؤ۔ ایسا نہ ہو گییتو کشتی میں بیٹھ کر چلا جائے۔“

پنا کو دوڑتا ہوا ساحل پر پہنچا۔ یہاں بہت سے لوگ کھڑے سمندر کی طرف اشارے کر رہے تھے۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ پنا کو نے ایک بُوڑھی عورت سے پوچھا۔

ایک بُوڑھا، چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر سمندر پار جا رہا ہے مگر سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ موجیں بَلّیوں اُچھل رہی ہیں اور کشتی ڈوبا چاہتی ہے۔“

”کشتی کہاں ہے؟“

”وہ۔۔۔ سامنے۔۔۔!“ عورت نے اشارے سے بتایا۔ پنا کو نے آنکھیں

پھاڑ کر دیکھا۔ دُور سے کشتی ایسی دکھائی دے رہی تھی جیسے چھوٹا سا نقطہ۔
وہ ایک چٹان پر چڑھ گیا اور چیخ کر بولا ”ابّا جان! ابّا جان۔۔۔! مت
جاؤ۔۔۔ واپس آجاؤ۔ میں آگیا ہوں۔۔۔ میں آگیا ہوں۔“

اِس کے ساتھ ہی زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گیپیتو نے اُس کی آواز سُن لی ہے کیونکہ جواب میں
وہ بھی ہاتھ ہلا رہا تھا اور کشتی کو ساحل کی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا
مگر طوفانی موجوں کے سامنے اُس کی ایک نہ چلتی تھی۔ وہ چپّو سے کشتی کو
ایک گز آگے دھکیلتا تو موجیں اُسے دس گز پیچھے لے جاتیں۔ یکا یک
ایک بہت زور کی موج بُلند ہوئی۔ اُس نے کشتی کو تنکے کی طرح اُوپر اُٹھا لیا
اور پھر اُسے لے کر نیچے بیٹھ گئی۔

”ہائے! بے چارہ بُڈّھا۔۔۔!“ کنارے پر کھڑے ہوئے لوگوں نے کہا۔

”اب اُسے خُدا ہی بچا سکتا ہے۔“

یکایک انہیں کسی لڑکے کی چیخیں سُنائی دیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرے ابّا! میرے ابّا۔۔۔! میں بھی آ رہا ہوں۔“ اور اِس سے پہلے کہ کوئی اُسے روکے، اُس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

٦

پناکو تمام رات سمندر میں تیرتا رہا۔ اُس کو صرف ایک ہی دُھن تھی۔ کسی طرح اپنے باپ کی کشتی تک پہنچ جائے۔ اُف! کیسی خوف ناک رات تھی۔۔۔! آسمان پر گھنگھور گھٹائیں جھوم رہی تھیں۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے دِل دہلا جاتا تھا۔ طوفانی موجیں بانسوں اُچھل رہی

تھیں اور وہ اُسے کاغذ کے پُرزے کی طرح کبھی اُوپر اُٹھا لیتیں، کبھی نیچے پٹخ دیتیں۔

صُبح کے وقت اُسے دُور کُچھ فاصلے پر زمین دِکھائی دی۔ سمندر کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ اُس نے جزیرے تک پہنچنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر ہیبت ناک موجوں کے آگے اُس کی ایک نہ چلی۔ وہ ایک فٹ آگے بڑھتا تو وہ پچاس فٹ پیچھے دھکیل دیتیں۔ خُدا کی قدرت! اچانک پیچھے سے ایک زبردست لہر آئی اور اُس نے پنا کو کو اُٹھا کر جزیرے کے ساحل پر ڈال دیا۔

پنا کو کے چوٹ تو بہت آئی مگر صحیح سلامت بچ جانے پر اُس نے خُدا کا شکر ادا کیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ یہ کیا جگہ ہے!

آہستہ آہستہ آسمان صاف ہوتا گیا۔ سورج کی روشنی پھیلتی گئی اور سمندر

میں طوفان تھم گیا۔ پناکو نے کنارے پر کھڑے ہو کر سمندر میں نگاہ دوڑائی کہ شاید گییتو کی کشتی نظر آ جائے مگر سوائے پانی کے اور کُچھ دکھائی نہ دیا۔

"اللہ جانے، یہ کون سا جزیرہ ہے!" پناکو نے دِل میں سوچا۔ "کوئی ملے تو اُس سے پوچھوں۔" یکایک ایک بڑی سی مچھلی تیرتی ہوئی کنارے پر آئی۔ پناکو نے اُسے پکارا۔ "بی مچھلی۔۔۔!اوبی مچھلی۔۔۔!ذرا سُنئے تو۔"

مچھلی قریب آئی تو پناکو نے کہا۔ "آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ایک نہیں، دو پوچھو۔" مچھلی نے مُسکرا کر کہا۔ وہ ایک ڈالفن مچھلی تھی اور ڈالفن مچھلیاں اپنی شرافت اور رحم دِلی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

"مہربانی فرما کر یہ بتایئے کہ یہاں کوئی ایسی بستی ہے، جہاں کوئی بھوکا پیٹ بھر کر روٹی کھا سکے اور اُسے یہ خطرہ نہ ہو کہ کوئی اُسے کھا لے گا؟"

”جی ہاں! کیوں نہیں،“ ڈالفن نے جواب دیا۔ ”تھوڑی دور ایک گاؤں ہے۔“

”کون سی راہ جاتی ہے؟“

”بائیں ہاتھ والی پگڈنڈی سیدھی اُدھر ہی جاتی ہے۔ ناک کی سیدھ میں چلے جاؤ۔“

”ایک بات اور بتائیے۔ آپ سمندر کے چپّے چپّے سے واقف ہیں۔ آپ نے کل یا آج سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی دیکھی ہے؟ اُس میں میرے والد صاحب سوار تھے؟“

”تمہارا والد کون ہے؟“

”وہ دُنیا کا سب سے شریف باپ ہے اور میں دُنیا کا سب سے کمینہ بیٹا!“ پنّا کو سر جھکا کر بولا۔

”کشتی غرق ہو گئی ہو گی۔“

”اور میرے ابّا۔۔۔؟“

”اُسے کسی وہیل مچھلی نے نِگل لیا ہو گا۔“

”کیا وہیل بہت بڑی ہوتی ہے؟“ پنا کو نے کانپ کر کہا۔

”اتنی بڑی۔۔۔! اتنی بڑی! جیسے کوئی پانچ منزل کا مکان۔“ ڈالفن نے اُسے بتایا۔ وہ پوری ریل گاڑی کو انجن سمیت ہڑپ کر سکتی ہے۔“

”ہائے، میرے اللہ۔۔۔! اچھّا، آپ کا بہت بہت شکریہ۔۔۔! مُجھے بھوک لگی ہے۔ بستی کی طرف جاتا ہوں۔“

وہ مچھلی کی بتائی ہوئی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا تو ڈر کے مارے بھاگنا شروع کر دیتا۔ اُسے دھڑکا لگا تھا کہ کہیں کوئی وہیل سمندر میں سے نکل کر اُسے ہڑپ نہ کر جائے۔

آدھے گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ بستی میں پہنچا۔ گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے بالکل بے پروا، اپنی اپنی راہ لگے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر شخص کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ پوری بستی میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہ آیا جو بے کار کھڑا وقت ضائع کر رہا ہو۔

"یہ جگہ میرے لیے مناسب نہیں۔" پنا کو بولا۔ "میں تو چھٹّی کے دِن پیدا ہوا تھا۔ مُجھے کام سے کیا کام؟"

اُس نے ایک دِن اور ایک رات سے کُچھ نہ کھایا تھا۔ ایک کھیل تک آکر منہ میں نہ گئی تھی۔ کھانا حاصل کرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ یا تو بھیک مانگی جائے اور یا کام کیا جائے۔ اس نے سوچا بھیک مانگ کر دیکھوں شاید کوئی اللہ کا بندہ ترس کھا کر کُچھ دے دے۔ پھر اُسے اپنے باپ کی ایک بات یاد آئی۔ گیپتو نے اُس سے کہا تھا۔ "بیٹا! بھیک صرف وہی لوگ

مانگتے ہیں جو اپاہج ہوں اور کام کاج نہ کر سکیں۔ تندرست لوگوں کو کام کر کے روزی کمانا چاہیے۔"

وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ اُس کی پیٹھ پر کوئلے کی دو بوریاں لدی ہوئی تھیں اور اُن کے بوجھ تلے وہ دبا جارہا تھا۔ پناکو نے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے۔ وہ جلدی سے اُس کے پاس گیا اور مسمسی صورت بنا کر بولا۔ "جناب! کل سے کُچھ نہیں کھایا۔ ایک آنہ دیں گے؟"

"ایک نہیں چار دوں گا۔" آدمی نے کہا۔ "مگر ایک بوری سر پر رکھ کر میرے گھر تک لے چلو۔"

"آپ مُجھے کیا سمجھتے ہیں؟" پناکو اکڑ کر بولا۔ "میں کوئی مزدور ہوں کہ بوجھ اُٹھاتا پھروں؟۔۔۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"تو پھر ایسا کرو۔" آدمی نے کہا۔ "اپنی شرافت کو شہد لگا کر چاٹو۔ مگر شہد تھوڑا ہی لگانا ورنہ بد ہضمی ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی گُزرا۔ اُس کے کاندھے پر چونے کی بوری رکھی ہوئی تھی۔

"بھائی!" پنا کو نے اُس کی خوشامد کی۔ "آپ ایک بھوکے، لاچار آدمی کو ایک اکنّی دینا پسند کریں گے؟"

"ضرور۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ بوری میرے گھر پہنچا دو۔ میں تمہیں ایک چھوڑ چار اکنیاں دُوں گا۔"

"مگر یہ تو بہت بھاری ہے۔" پنا کو نے مُنہ بنا کر کہا: "میں تھک جاؤں گا۔"

"اگر تُم تھکنا نہیں چاہتے تو پھر روٹی کے بجائے ہوا کھاؤ۔" اُس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

آدھے گھنٹے میں پندرہ بیس آدمی اُدھر سے گزرتے، اِن سب کو پناکو نے اپنی دُکھ بھری کہانی سُنائی۔ سب نے اُسے لعنتیاں دیں اور کہا۔ ”ہٹّے کٹّے ہو کر بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟ کام کیوں نہیں کرتے؟“

سب سے آخر میں ایک عورت آئی۔ اُس کے کولھوں پر دو گھڑے رکھے تھے۔ پناکو لپک جھپک اُس کے پاس گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ”امّاں جی! پیاس لگی ہے۔ تھوڑا سا پانی پلاؤ گی؟“

”کیوں نہیں بیٹا! لو پیو۔۔۔“ اُس نے گھڑے کا منہ جھُکایا۔

پناکو نے اوک سے پانی پیا اور پھر مُنہ صاف کر کے بولا۔ ”کاش! اتنا

کھانے کو بھی مل جاتا، جتنا پانی پیا ہے۔"

عورت بولی۔ "اگر تُم ایک گھڑا اُٹھا کر میرے گھر تک لے چلو تو میں تمہیں دو روٹیاں دوں گی۔"

پنا کو نے سہم کر گھڑے کی طرف دیکھا اور خاموش کھڑا رہا۔

"روٹیوں کے ساتھ چٹ پٹا سالن بھی دوں گی۔"

پنا کو نے دوبارہ گھڑے کی طرف دیکھا مگر اُس کے منہ سے نہ "ہاں" نکلی اور نہ "نہ!"

"مٹھائی بھی دوں گی۔" عورت نے لالچ دیا۔

اب پنا کو سے ضبط نہ ہو سکا۔ جھٹ بول اُٹھا۔ "اچھّی بات ہے۔ لاؤ۔ میرے سر پر رکھ دو۔"

دونوں گھر پہنچے تو عورت نے پنا کو کو ایک صاف ستھری چٹائی پر بِٹھا دیا

جس پر دستر خوان بِچھا ہوا تھا اور دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ پنا کو نے بغیر پوچھے گچھے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور اتنا ٹھونس ٹھونس کر کھایا کہ ناک تک پیٹ بھر گیا۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے۔" اُس نے ڈکار لے کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور پھر جو سر اُوپر اٹھایا تو مارے حیرت کے اُچھل پڑا۔۔۔ "ت ت ت تُم۔۔۔ م م م میں۔۔۔!"

اُس کا مُنہ کھُلا ہوا تھا اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ اتنے حیران کیوں ہو؟" عورت بولی۔

"ابھی ابھی تو آپ۔۔۔ اچھّی بھلی۔۔۔ عورت تھیں۔۔۔ اور ایکا ایکی۔۔۔ ایکا ایکی۔۔۔ اے میرے اللہ! یہ خواب ہے یا حقیقت؟۔۔۔"

اُس کا سر چکرا گیا اور وہ غش کھا کر فرش پر گِر پڑا۔

۷
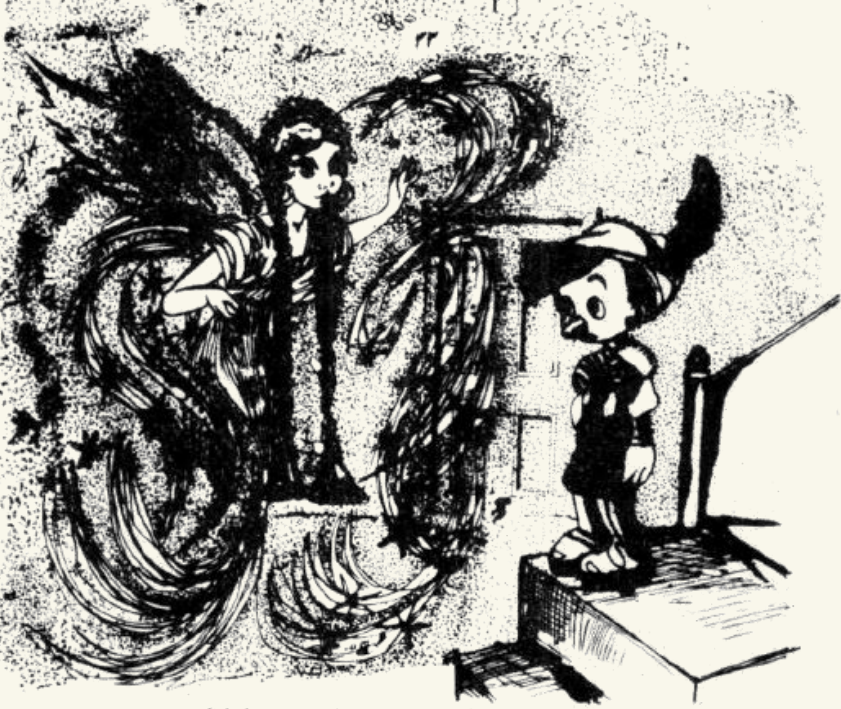
وہ نیک عورت، اصل میں پری تھی اور سینکڑوں سال سے اِس جزیرے میں رہتی تھی۔ گھر سے باہر جاتی تو انسان کا بھیس بدل لیتی اور گھر آتی تو پھر پری بن جاتی۔ اُس نے بے ہوش پنا کو کو اُٹھا کر پلنگ پر لِٹایا اور ماتھے

پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اُسے بخار ہے۔ وہ دوڑ کر گلاس میں پانی لائی اور اُس میں دوا گھول کر پنا کو کو پلانے جھُکی۔ گلاس ہونٹوں سے لگنا تھا کہ پنا کو نے آنکھیں کھول دیں۔

"لو۔۔۔! یہ دوا پی لو۔" پری نے کہا۔ "تمہیں بخار ہے۔"

پنا کو نے گلاس کو دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ "کڑوی ہے کہ میٹھی؟"

"کڑوی تو ہے مگر اِسے پی کر تمہارا بخار اُتر جائے گا۔"

"کڑوی ہے تو دُور ہی رکھیے۔"

"ضد نہ کرو۔ پی لو۔"

"مُجھے کڑوی چیزیں پسند نہیں۔"

"اِسے پی لو۔۔۔ پھر میں تھوڑی سی شکر دوں گی۔ اُس سے تمہارے منہ کا مزا ٹھیک ہو جائے گا۔"

”شکر کہاں ہے؟“

”یہ رہی۔۔۔“ پری نے شکر کا برتن دِکھایا۔

”پہلے شکر دیجیے، پھر دوا پیوٴں گا۔۔۔“

”وعدہ کرتے ہو؟“

”وعدہ کرتا ہوں۔“

پری نے تھوڑی سی شکر دی۔ پنا کو نے کھا کر ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ”اگر شکر دوا ہوتی تو کتنا اچھّا ہوتا۔۔۔! میں روز کھایا کرتا۔“

”اچھّا! اب اپنا وعدہ پورا کرو۔“ پری نے کہا۔

پنا کو نے گلاس ہاتھ میں لے کر اُسے سونگھا اور اُبکائی لے کر بولا۔ ”یہ تو بہت ہی کڑوی ہے۔“

”پیے بغیر تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟“

”اِس کی بُو ہی بتا رہی ہے۔۔۔ تھوڑی سی شکر اور دیجیے، پھر پیؤں گا۔“

پری نے تھوڑی سی شکر اور دی اور پھر اُس کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں، مُجھ سے نہیں پی جائے گی۔“ پنا کو مچل کر بولا۔

”آخر کیوں۔۔۔؟“

”یہ تکیہ بہت نیچا ہے۔“

پری نے ایک دوسرا تکیہ رکھ دیا۔

”ہائے اللہ۔۔۔! کہہ تو دیا، نہیں پیؤں گا۔“

”اب کیا بات ہے؟“

”دروازہ کھلا ہے۔“

پری نے دروازہ بھی بند کر دیا۔

”نہیں، نہیں، نہیں!“ پناکو نے چیخ کر کہا۔ ”میں یہ کڑوی کسیلی دوا کبھی نہیں پیوں گا۔“

”میرے بچّے! دوا نہیں پیو گے تو بعد میں افسوس کرو گے۔“

”پروا نہیں۔۔۔“

”تم مر جاؤ گے۔“

”پروا نہیں۔۔۔ دوا پینے سے مر جانا اچھّا۔“

”اچھّی بات ہے۔ یہ دیکھو۔۔۔“ پری نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

اچانک دروازہ کھلا اور چار کالے بھُجنگ آدمی ایک چارپائی کاندھوں پر رکھے اندر داخل ہے۔ چارپائی پر ایک سفید بُراق کفن رکھا ہوا تھا۔

”تُم کون ہو۔۔۔؟“ پنا کو نے خوف سے کپکپا کر کہا۔

”ہم موت کے فرشتے ہیں۔ تمہیں لینے آئے ہیں۔۔۔“

”ف۔۔۔ف۔۔۔ف فرشتے؟“ پنا کو آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”مگر مَیں تو زندہ ہوں۔“

”ابھی تو زندہ ہو، لیکن اگر تم نے فوراً ہی دوا نہ پی تو مر جاؤ گے۔“

”او، میری پیاری پری۔۔۔! او میری اچھّی پری۔۔۔! لاؤ! مُجھے دوا دو اور اِن موت کے فرشتوں کو باہر نکال دو۔“

یہ کہہ کر اُس نے پری کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں ساری دوا پی گیا۔ کالے بھجنگ آدمی چارپائی لے کر چلے گئے۔

دوا کا حلق سے اُترنا تھا کہ پنا کو کا بخار جاتا رہا اور وہ بھلا چنگا ہو کر کمرے میں اُچھلنے کودنے لگا۔

”دیکھا۔۔۔! دوا پیتے ہی اچھّے ہو گئے۔“ پری نے مُسکرا کر کہا۔

”سچ مچ، دوا تو جادُو تھی، میں مرتے مرتے بچا۔۔۔“

”پھر تُم پینے میں آنا کانی کیوں کر رہے تھے؟“

”آپ نہیں جانتیں، سب بچّے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ بیماری سے اتنا نہیں ڈرتے، جتنا دوا سے ڈرتے ہیں۔“

”یہ تو بہت بُری بات ہے۔“ پری نے کہا۔ ”بچّوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ بیماری کو دُور کرنے کے لیے دوا بہت ضروری چیز ہے۔ جو بیمار دوا نہیں پیتے، وہ مر جاتے ہیں۔“

”آیندہ خیال رکھوں گا۔۔۔ مُجھے وہ موت کے فرشتے ہمیشہ یاد رہیں گے۔“ پنا کو ہنس کر بولا۔

”شاباش!“ پری نے خوش ہو کر کہا۔ ”اچھّا، اب یہ بتاؤ کہ تُم کون ہو اور

اِس جزیرے میں کیسے آ گئے؟"

پناکو نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سُنائی اور بولا۔ "افسوس! اب میں اپنے پیارے باپ سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔۔۔ اُنہیں سمندری مچھلیاں کھا گئی ہوں گی۔"

"نہیں۔۔۔" پری نے کہا۔ "وہ زندہ ہے اور تُم اُس سے مل سکتے ہو۔"

"سچ مچ۔۔۔!" پناکو خوشی سے چلّا کر بولا۔ "وہ کہاں ہیں؟ میں ابھی اُن کے پاس جاؤں گا۔"

"ایسے نہیں۔۔۔" پری نے کہا۔ "پہلے تمہیں اچھّا لڑکا بننا پڑے گا۔"

"تو کیا میں اچھّا لڑکا نہیں؟"

”نہیں۔ اچھّے لڑکے اپنے بڑوں کا کہا مانتے ہیں۔“

”اور میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔“

”اچھّے لڑکے دِل لگا کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔۔۔“

”اور میں کھیل کُود کو پسند کرتا ہوں۔“

”اچھّے لڑکے ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔“

”اور میں ہمیشہ جھوٹ بولتا ہوں۔۔۔ لیکن اب وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے کوئی بُرا کام نہیں کروں گا اور اچھّا لڑکا بن کر اپنے باپ کی خدمت کروں گا۔ ہا۔۔۔! بے چارہ گیپیتو۔۔۔! پیارے ابّا! تُم کہاں ہو۔۔۔؟“

”گھبراؤ نہیں۔ اگر تُم اچھّے لڑکے بن گئے تو تمہیں گیپیتو مل جائے گا۔“

”میں آپ کو امّی کہا کروں گا۔ کیا آپ میری امّی بننا پسند کریں گی؟“

”ضرور۔۔۔ مگر شرط یہ ہے کہ تُم میرا کہا مانو۔“

”میں کبھی آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔“

”اچھّا۔۔۔! کل سے تُم اسکول جاؤ گے۔“

اسکول کا نام سُن کر پنا کو کی ساری خُوشی خاک میں مل گئی۔ اُس کا کِھلا ہوا چہرہ ایک دم مُرجھا گیا۔

”اور جب تُم خوب پڑھ لکھ لو گے تو پیٹ پالنے کے لیے کام کاج کرو گے۔“

پنا کو کے ہونٹ ہلنے لگے۔

”تُم کیا بڑبڑا رہے ہو۔۔۔؟“ پری نے پوچھا۔

”میں کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ میں اتنا بڑا تو ہو گیا، اب میرا اسکول جانا بھلا لگے گا؟“

”عِلم حاصل کرنے کے لیے عُمر کی کوئی قید نہیں۔ تُم تو ابھی بچّے ہو، بُوڑھے بُوڑھے آدمی پڑھتے ہیں۔۔۔“

”اچھّا، چلیے، آپ کے کہنے سے اسکول چلا جایا کروں گا، مگر مُجھے کام کرنا اچھّا نہیں لگتا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”کام کرنے سے میں تھک جاتا ہوں۔“

”میرے بچّے!“ پری نے کہا۔ ”روٹی کھانے اور کپڑا پہننے کے لیے ہر شخص کو کوئی نہ کوئی کام ضرور کرنا پڑتا ہے، چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ کاہلی، کام چوری ایک خطرناک بیماری ہے۔ اگر بچپن ہی میں تُم اِس بیماری میں مبتلا ہو گئے تو عُمر بھر اِس سے چھٹکارا نہ پا سکو گے۔ پھر یا تو بھیک مانگو گے اور یا جیل کی ہوا کھاؤ گے۔“

پنا کو نے جلدی سے اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور بولا۔ ”میں پڑھوں گا۔ میں ضرور پڑھوں گا اور ہر وہ کام کروں گا، جس کا آپ حکم دیں گی۔“

”شاباش!“ پری نے کہا۔ ”اگر تُم نے میرا کہا مانا تو نہ صرف تمہارا پیارا باپ تمہیں مل جائے گا بلکہ اللہ میاں خوش ہو کر تمہیں سچ مچ کا لڑکا بھی بنا دیں گے۔“

”سچ مچ کا لڑکا!“ پنا کو حیرت سے اُچھل کر بولا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ میں کٹھ پُتلے سے سچ مچ کا انسان بن جاؤں گا؟“

”بالکل۔۔۔!“ پری بولی۔

دوسرے دِن سے پنا کو اسکول جانے لگا۔ شریر لڑکوں نے کٹھ پُتلا سمجھ کر اُسے بنانے کی کوشش کی۔ کسی نے اُس کی ٹوپی اُتاری، کسی نے کوٹ کھینچا۔ کوئی روشنائی سے اُس کے ہونٹوں پر پونچھیں بنانے لگا اور ایک

لڑکے نے تو حد ہی کر دی۔ اُس نے پنا کو کے بازوؤں میں ڈور باندھی اور لگا اُسے نچانے۔ پنا کو دو ایک دِن تک تو اُن کی شرارتیں چُپ چاپ سُنتا رہا مگر آخر کب تک! ایک دِن اُس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا اور اُس نے دو تین لڑکوں کی ایسی ٹھکائی کی کہ وہ توبہ توبہ پُکار گئے۔ اِس کے بعد تمام شریر لڑکے اُس سے ڈرنے لگے اور پھر کبھی کسی نے اسے چھیڑنے کی جرأت نہیں کی۔

پنا کو اسکول بھر میں سب سے محنتی اور نیک لڑکا تھا۔ استاد اُس سے بہت خوش تھے۔ وہ صُبح کو سب سے پہلے آتا اور سہ پہر کو سب سے آخر میں جاتا۔ اُس میں ساری باتیں اچھّی تھیں، سوائے ایک بات کے۔ اُس کے دوست بہت تھے۔ اُن میں ایسے لڑکے بھی تھے، جنہیں پڑھنے لکھنے سے نفرت تھی اور جب بھی اُنہیں موقع ملتا، اسکول سے بھاگ جاتے۔ اُستاد نے پنا کو کو کئی بار سمجھایا کہ بُرے لڑکوں کی صحبت میں نہ رہا کرو، وہ

تمہیں بھی خراب کر دیں گے۔ پری نے بھی اسے نصیحت کی:

"پناکو بیٹے! دوستوں کے معاملے میں تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔ صرف ایسے لڑکوں کو دوست بناؤ، جو نیک اور پڑھنے لکھنے کے شوقین ہوں۔ ہر شخص کو بے سوچے سمجھے دوست بنالینا ٹھیک نہیں۔ بُرے لڑکے تمہارا دِل بھی تعلیم سے اُچاٹ کر دیں گے اور کیا خبر ہے، اُن کی وجہ سے تُم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔"

"آپ فکر نہ کریں امّی!" پناکو نے کندھے جھٹک کر کہا اور اپنے سر کو اُنگلی سے اِس طرح تھپتھپایا، جیسے کہہ رہا ہو۔ "اِس میں کافی عقل ہے۔"

ایک دِن کا ذکر ہے، پناکو اسکول جا رہا تھا کہ راستے میں چھ سات آوارہ دوست مل گئے۔

"آؤ یار پناکو۔۔۔!خوب ملے!"

ایک نے کہا۔ "تُم نے وہ خبر سُنی؟"

"کون سی۔۔۔؟" پناکو نے پوچھا۔

"سمندر کے کنارے ایک وہیل مچھلی آئی ہوئی ہے۔" دوسرے نے بتایا۔

"مچھلی کیا ہے، پہاڑ ہے پہاڑ!" تیسرے نے کہا۔ "آؤ۔۔۔! چل کر دیکھیں!"

"مُجھے تو معافی دو۔۔۔ میں اسکول جارہاہوں؟"

"اسکول کہیں بھاگا جارہاہے؟" چوتھا بولا۔ "کل چلے جانا۔۔۔ ایک آدھ

سبق نہیں پڑھو گے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔"

"لیکن اُستاد کیا کہیں گے؟"

"بھو نکنے دو اُنہیں۔ اُنہیں تو تنخواہ ہی اِس بات کی ملتی ہے۔"

"اور میری امّی؟"

"انہیں کیا پتا چلے گا۔ وہ سمجھیں گی، تُم اسکول میں ہو۔"

"لیکن ہم اسکول کے بعد بھی تو جا سکتے ہیں؟"

"لو، اور لو! تمہارا خیال ہے کہ وہیل ہمارے انتظار میں سارا دِن بیٹھی رہے گی؟ کیا خبر، ہمارے جاتے جاتے ہی کہیں اور چلی جائے۔ یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا، اُستاد۔۔۔! آؤ چلیں۔"

"وہاں تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟" پنا کو نے پوچھا۔

”جانے اور آنے میں مُشکل سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔“

”تُم نہیں مانتے تو چلو۔“ پنا کو نے کہا اور وہ اُن کے ساتھ سمندر کی طرف چل پڑا۔

پنا کو کا چہرہ خوشی سے تمتمار ہا تھا اور وہ اِس طرح دوڑ رہا تھا جیسے پَر لگ گئے ہوں۔ جب سے کبوتر نے اُسے اِس عجیب و غریب مچھلی کے متعلّق بتایا تھا، اُسے اُس کے دیکھنے کا بہت شوق تھا، لیکن اُس بے چارے کو یہ پتا نہیں تھا کہ اُس کا یہ شوق اُسے ایک مُصیبت کے منہ میں لیے جا رہا ہے۔

۸

سمندر کے کنارے پہنچ کر پنا کو نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر وہیل مچھلی کہیں بھی دِکھائی نہ دی۔۔۔

"کہاں ہے وہ وہیل مچھلی؟" اُس نے لڑکوں سے پوچھا۔

"شاید ناشتا کرنے گئی ہے۔" ایک لڑکے نے ہنسی روک کر کہا۔

"یا شاید قیلولہ کر رہی ہو۔" دوسرا قہقہہ لگا کر بولا۔

پنا کو سمجھ گیا کہ اِن شیطانوں نے اُسے بے وقوف بنایا ہے۔ وہ غصّے سے بولا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟ تُم مُجھے دھوکا دے کر یہاں کیوں لے آئے؟"

"ہم چاہتے تھے کہ آج تُم اسکول نہ جاؤ۔ روزانہ بلا ناغہ اسکول جاتے ہو۔ ایک دِن بھی غیر حاضر نہیں ہوتے۔"

"میرے اسکول جانے، نہ جانے سے تمھیں کیا؟"

"بہت کُچھ ہے۔۔۔ تُم روز اسکول جاتے ہو اور ہم ہفتے میں دو تین چھٹیاں کرتے ہیں۔ اُستاد تمھاری مثال دے کر ہمیں شرم دِلاتے ہیں۔"

"اچھّا۔۔۔! تُم چاہتے کیا ہو؟"

”ہمارے تین دُشمن ہیں، اسکول، پڑھائی اور اُستاد۔ ہم چاہتے ہیں کہ اِن دُشمنوں کے خلاف تُم بھی ہمارا ساتھ دو۔“

”چھی۔۔۔ چھی۔“ پنا کو نے نفرت سے کہا۔

”دیکھو پنا کو تمہیں ہماری بات ماننا پڑے گی۔۔۔ ورنہ۔۔۔“ ایک لڑکے نے مُٹھّی بھینچ کر اُس کی ناک کے سامنے لہرائی۔ ”یاد رکھو۔۔۔ ہم سات ہیں اور تُم ایک۔۔۔!“

”سات مُردے کہو۔۔۔“ پنا کو نے مُنہ چِڑا کر کہا۔

”سُنتے ہو؟۔۔۔ یہ ہماری بے عزّتی کر رہا ہے۔“ ایک لڑکے نے چیخ کر کہا۔

یہ سُن کر سب سے بڑا لڑکا آگے بڑھا اور اُس نے پنا کو کے سر پر مُکّا مارا۔ پنا کو کو بھی غصّہ آگیا۔ اُس نے اس لڑکے کے اتنی زور کا گھونسا رسید کیا کہ

وہ لڑکھڑا کر گِر پڑا۔ یہ دیکھ کر تمام لڑکے اُس پر ٹوٹ پڑے اور باقاعدہ جنگ چِھڑ گئی۔

پنا کو سات کے مُقابلے میں اکیلا تھا مگر اُس نے ایسی بہادری سے اُن کا مقابلہ کیا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ گھبرا گئے اور ایسی چیز ڈھونڈنے لگے جسے پھینک کر مار سکیں۔ چونکہ ریت کے سوا وہاں اور کوئی چیز نہ تھی، اِس لیے اُنھوں نے اپنی کتابیں پنا کو کی طرف پھینکنا شروع کر دیں۔ پنا کو اِدھر اُدھر ہٹ کر اُن کا وار بچاتا رہا اور کتابیں ایک ایک کر کے سمندر میں گِرتی رہیں۔

جب اُن کی تمام کتابیں سمندر کی نذر ہو گئیں تو اب اُنہیں کسی دوسری چیز کی تلاش ہوئی۔ کُچھ فاصلے پر پنا کو کی کتابیں پڑی تھیں۔ اُن میں حساب کی ایک موٹی سی کتاب بھی تھی۔ ایک لڑکے نے جلدی سے وہ کتاب اُٹھائی اور پوری طاقت سے پنا کو کے کھینچ ماری، مگر وہ پنا کو کے لگنے

کے بجائے ایک دوسرے لڑکے کے سر پر جا لگی اور وہ بے ہوش ہو کر دھم سے زمین پر ِگر پڑا۔

لڑکے کو گرتا دیکھ کر اُس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ پنا کو لاکھ برا سہی، پھر بھی اُس کے سینے میں رحم بھرا دِل تھا۔ اُس نے سوچا اگر میں بھی اِسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا تو یہ مر جائے گا۔ اُس نے اپنا رومال پانی میں بھگویا اور لڑکے کے ماتھے پر پھیرنے لگا۔ ساتھ ہی زور زور سے چلّانے بھی لگا۔ ”دوڑو۔۔۔ دوڑو۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ بچاؤ!“

اچانک اُسے کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو پولیس کے دو سپاہی کھڑے تھے۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ اُنھوں نے پوچھا۔

”یہ۔۔۔ لڑکا۔۔۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔“

”زخمی ہے۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔!“

ایک سپاہی نے جھُک کر لڑکے کو دیکھا۔ ”ارے! اِس کے سر پر تو چوٹ لگی ہے۔ کس نے مارا اِس کو؟“

”میں۔۔۔ میں نے نہیں مارا جناب؟“ پنا کو نے خوف سے کانپ کر کہا۔

”تُم نے نہیں مارا تو کس نے مارا؟“

پنا کو کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔

”اِس کے سر پر چوٹ کیسے لگی۔۔۔۔۔۔؟“ سپاہیوں نے پوچھا۔

”اِس کتاب سے۔۔۔“ پنا کو نے اُنہیں کتاب دِکھائی۔

”یہ کس کی کتاب ہے؟“

”میری۔۔۔“

”بس تو معاملہ صاف ہے۔ تُم ہی نے اِسے مارا ہے۔ اُٹھو! ہمارے ساتھ چلو۔“

”لیکن۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“

”اٹھو۔۔۔ اٹھو۔۔۔“ سپاہیوں نے ڈانٹ کر کہا۔

اتنے میں اُدھر سے چند ماہی گیر گزرے۔ سپاہیوں نے اُنھیں روک لیا اور بولے۔ ”یہ بچّہ بے ہوش ہے۔ اِس کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ گھر لے جا کر اُس کی دیکھ بھال کرو۔ ہم کل آ کر لے جائیں گے۔“

اب وہ پنّاکو کی طرف مُڑے اور ڈپٹ کر بولے۔ ”فارورڈ مارچ!“

پنّاکو کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ گِرتا پڑتا سپاہیوں کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ڈراؤنا

خواب دیکھ رہا ہے اور جلد ہی آنکھ کھُل جائے گی مگر اس کی آنکھ نہ کھُلی اور بستی آگئی۔

اب اُسے ایک نیا خیال پریشان کرنے لگا۔ اُس نے سوچا۔ ”اگر سپاہی پری کے گھر کے پاس سے گُزرے اور اُس نے مُجھے اِس حالت میں دیکھ لیا تو وہ کیا خیال کرے گی۔ کاش! زمین پھٹ جائے اور میں اُس میں سما جاؤں۔ اِس ذلّت سے تو موت اچھّی۔“

بستی آگئی تھی اور وہ اُس میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور پنا کو کی ٹوپی اُڑ کر دُور جا پڑی۔ پنا کو رُک گیا اور سپاہیوں سے بولا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو ٹوپی اُٹھالاؤں۔“

”جاؤ۔۔۔ جلدی سے لے کر

آؤ۔“ اُنھوں نے کہا۔

پناکو نے دوڑ کر ٹوپی اُٹھالی لیکن

بجائے اِس کے کہ وہ سپاہیوں کی

طرف آتا، پوری طاقت سے

سمندر کی طرف دوڑنے لگا۔ سپاہیوں نے دیکھا کہ وہ دوڑ کر اُسے نہیں

پکڑ سکتے تو اُنھوں نے اُس کے پیچھے ایک خونخوار کُتّا ڈال دیا۔ یہ کُتّا اِس

سال کُتّوں کی دوڑ میں پہلا انعام جیت چُکا تھا مگر پناکو بھی کُچھ کم نہ تھا۔ اُس

کی لکڑی کی ٹانگیں اُسے اُڑائے لیے جا رہی تھیں۔ بستی کے لوگ بڑی

دلچسپی سے یہ دوڑ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے لیے تو یہ ایک انوکھا تماشا تھا۔

اِس سے پہلے اُنھوں نے کُتّے اور انسان کی دوڑ کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس دوڑ کے دوران میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کُتّا پناکو کے بالکل قریب پہنچ

گیا اور پنا کو کو اُس کی گرم گرم سانس اپنی گردن پر محسوس ہوئی۔ وہ سمجھا کہ کھیل ختم ہو گیا اور اب کُتّا اسے بھنبھوڑ ڈالے گا مگر خوش قسمتی سے سمندر کا کنارا قریب آ گیا تھا اور اِس سے پہلے کہ کُتّا اُسے پکڑے، اُس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کُتّا اُس سے دو قدم پیچھے تھا اور اتنی تیز دوڑ رہا تھا کہ کنارے پر پہنچ کر اپنے آپ کو روک نہ سکا اور غڑاپ سے سمندر میں گِر پڑا۔

کُتّے کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ وہ غوطے کھانے لگا۔ ایک دفعہ غوطہ لگا کر اُوپر اُبھرا تو گھبرا کر بولا۔ "بچاؤ بچاؤ۔ میں ڈوب رہا ہوں۔"

پنا کو تیرتا ہوا دور چلا گیا تھا۔ اُس نے مُڑ کر پیچھے دیکھا اور بولا۔ "جہنّم میں جاؤ، تمہارا علاج یہی ہے۔"

"بچاؤ۔ پیارے پنا کو۔۔۔! خُدا کے لیے مجھے بچاؤ۔" کُتّے نے بڑی عاجزی

سے کہا۔

اس کی منّت سماجت سے پنا کو کا دِل موم ہو گیا۔ وہ تیرتا ہوا اُس کے پاس آیا اور بولا۔ "پہلے وعدہ کرو کہ میرا پیچھا نہ کرو گے۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔ خُدا کے لیے بچاؤ۔" کُتّے نے کہا۔

پنا کو نے سوچا، دُشمن کی بات کا اعتبار کرنا عقل مندی نہیں۔ مُمکن ہے یہ اپنے وعدے سے مُکر جائے لیکن پھر اُسے اپنے باپ کی ایک نصیحت یاد آ گئی۔ گیپیتو نے ایک دِن اُس سے کہا تھا۔ "بیٹا! نیکی کبھی برباد نہیں جاتی۔۔۔" وہ پھُرتی سے کُتّے کی طرف بڑھا اور اُسے سہارا دے کر کنارے تک پہنچا دیا۔

"خُدا حافظ!" اُس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ اُمّید ہے تُم کُچھ دیر بعد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

”خُدا حافظ ! بھائی پنا کو۔۔۔!“ کُتّے نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا اور موقع پڑا تو اِس کا بدلہ بھی چُکا دوں گا۔“

پنا کو کنارے کے ساتھ ساتھ تیرنے لگا۔ جب وہ کافی دُور نکل گیا تو اُسے کنارے پر ایک غار میں سے دھواں نکلتا دِکھائی دیا۔ اُس نے سوچا۔ ”بس یہ جگہ ٹھیک ہے۔ یہاں سپاہی نہیں آئیں گے۔ کُچھ دیر اِس غار میں آگ کے پاس بیٹھ کر کپڑے سکھاؤں گا اور پھر۔۔۔ جو قسمت کو منظور ہوا۔“

وہ جلدی جلدی کنارے کی طرف بڑھا لیکن ابھی خُشکی تک نہ پہنچا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی چیز اسے اُوپر اُٹھا رہی ہے۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی، مگر بھاگتا تو کیسے؟ وہ چیز تو اُسے چاروں طرف سے جکڑ رہی تھی۔ وہ کسی مچھیرے کے جال میں پھنس گیا تھا اور اُس کے اِرد گرد بے شمار مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔

یکایک غار میں سے ایک مچھیرا نکلا۔ اُس کی صورت ایسی ڈراؤنی تھی کہ پناکو کا آدھا خُون خُشک ہو گیا۔ مچھیرے نے باہر آکر سمندر میں سے جال نکالا اور خوش ہو کر بولا:

"اوہو! بہت دِنوں کے بعد جال بھرا ہوا نکلا ہے۔۔۔ اب تو میں خوب پیٹ بھر کر مچھلیاں کھاؤں گا۔"

"اے اللہ! تیرا شُکر ہے کہ میں مچھلی نہیں۔" پناکو نے اطمینان کا سانس لیا۔

ماہی گیر جال گھسیٹ کر غار میں لے گیا۔ غار کے بیچوں بیچ چولہے پر ایک بڑی سی کڑاہی رکھی تھی جس میں تیل کڑ کڑا رہا تھا۔ اُس نے جال میں ہاتھ ڈال کر مُٹھّی بھر مچھلیاں نکالیں، اُنہیں سونگھا اور بولا۔ "آہا! بڑی مزے دار معلوم ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر اُنہیں پاس رکھے ہوئے ایک ٹب

میں پھینک دیا۔ اِسی طرح وہ مُٹھّی بھر بھر کے جال میں سے مچھلیاں نکالتا رہا اور ٹب میں پھینکتا گیا۔ اب جال میں صرف پناکو رہ گیا۔ مچھیرا اُسے دیکھ کر حیرت سے اُچھل پڑا اور چیخ کر بولا۔ "آئیں! یہ کیسی مچھلی ہے؟ میں نے زندگی بھر ایسی مچھلی نہیں دیکھی۔"

اس نے پناکو کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سوچتے ہوئے بولا۔ "اب سمجھا۔ یہ شاید دریائی گھوڑا ہے۔"

پناکو کو بہت غصّہ آیا۔ وہ تیزی سے بولا۔ "گھوڑے ہوگے تُم۔ میں تو کٹھ پُتلا ہوں۔"

"کٹھ پُتلا۔۔۔؟" یہ مچھلی کوئی نئی قسم کی ہے؟ خیر، تو کٹھ پُتلا ہو یا دریائی گھوڑا، سب سے پہلے میں تُجھے ہی کھاؤں گا۔"

"مُجھے کھاؤ گے؟" پناکو گھبرا کر بولا۔ "او خُدائی خوار! خُدا کو مان۔ میں

مچھلی نہیں ہوں۔ دیکھتا نہیں، میں تیری طرح باتیں کر رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" مچھیرا اطمینان سے بولا۔ "سُنا ہے سمندر میں باتیں کرنے والی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں اور ایسی مچھلیاں بہت مزے دار ہوتی ہیں۔"

پنا کو بہت رویا پیٹا، چیخا چلّایا، منّتیں کیں، ایڑیاں رگڑیں مگر مچھیرے نے ایک نہ سُنی۔ اُس نے پنا کو کے کپڑے اُتارے، جسم پر مسالا لگایا اور پھر گردن پکڑ کر کڑاہی کی طرف بڑھا۔۔۔

۹

مچھیرا، پناکو کو کڑاہی میں ڈالنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک کُتّا دوڑتا ہوا اندر آیا اور للچائی ہوئی نظروں سے مچھلیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مچھیرے نے ڈانٹ کر کہا۔ ”بھاگ جا۔۔۔! بھاگ یہاں سے!“

کُتّا بہت بھوکا تھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”پہلے کُچھ کھانے کو دو۔۔۔ پھر جاؤں گا۔“

”میں کہتا ہوں، دفع ہو یہاں سے۔“ مچھیرے نے چیخ کر کہا۔

کُتّے نے سُنی ان سُنی ایک کر دی۔ اُس نے دانت نکال لیے اور غُرّانے لگا۔ پناکو کی گردن مچھیرے کی مُٹھّی میں تھی اور مُنہ کڑاہی کی طرف۔ اُس نے زور لگا کر گردن پھیری اور کُتّے کو دیکھا تو جھٹ پہچان گیا۔ یہ وہی کیا تھا، جسے اُس نے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اُس نے زور سے کہا۔

”بچاؤ! بچاؤ! مُجھے اِس ظالم سے بچاؤ۔“

کُتّے نے آواز سُن کر پناکو کی طرف دیکھا اور وہ بھی اُسے پہچان گیا۔ اُس نے ایک دم قلانچ ماری اور پناکو کو مُنہ میں دبا کر یہ جا، وہ جا۔ مچھیرا بہت موٹا تھا۔

اُس نے کُچھ دُور تو پیچھا کیا۔ پھر کوستا پیٹتا واپس آ گیا۔

کُچھ دُور جا کر کُتّا ٹھہر گیا اور اُس نے پنا کو کو آہستہ سے زمین پر ڈال دیا۔

"کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں!" پنا کو نے کہا۔

"شکریے کی ضرورت نہیں بھائی پنا کو!" کُتّے نے جواب دیا۔ "پہلے تُم نے میری جان بچائی تھی۔ میں نے اِسی احسان کا بدلہ چکایا ہے، لیکن ذرا سوچو تو۔ اگر مُجھے ایک منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو۔۔۔ تو۔۔۔!"

"نہ کہو۔۔۔ خُدا کے لیے آگے نہ کہو۔" پنا کو نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔ "اِس خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

کُتّا ہنس پڑا۔ اُس نے اپنا پنجہ آگے بڑھایا۔ پنا کو نے اُسے ہاتھ میں لے کر دبایا اور پھر دونوں جُدا ہو گئے۔

پنا کو بستی کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں وہ جگہ آئی جہاں اُس کی لڑکوں

سے لڑائی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک مچھیرا بیٹھا جال ٹھیک کر رہا تھا۔ پنا کو نے اُسے سلام کیا اور بولا۔ ”کیوں بھائی! آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اُس لڑکے کا کیا ہوا جس کے سر پر چوٹ لگ گئی تھی؟“

”اُسے ایک ماہی گیر اپنے گھر لے گیا تھا اور۔۔۔“

”وہ مر گیا۔۔۔؟“ پنا کو نے کانپ کر کہا۔

”مرا کہاں۔۔۔ اچھّا ہو گیا اور اپنے گھر چلا گیا۔“

”سچ مُچ۔۔۔؟“ پنا کو خوش ہو کر بولا۔ ”اُس کے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی؟“

”نہیں۔ لیکن اگر کتاب ذرا اور زور سے لگ جاتی تو وہ مر جاتا۔“

”کس نے مارا تھا اُسے؟“ پنا کو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”اُس کے ایک ہم جماعت نے، جِس کا نام پنا کو ہے۔“ مچھیرے نے کہا۔

”وہ کون ہے؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک آوارہ اور نکھٹّو لڑکا ہے لیکن تُم اتنا کُرید کُرید کر کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بات یہ ہے کہ وہ لڑکا جس کے چوٹ لگی تھی، میرے محلّے میں رہتا ہے۔“

”ہوں۔۔۔!“ مچھیرے نے اُسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ تمہارے جسم پر کیا لگا ہے؟“

”میں۔۔۔ میں ایک گڑھے میں گِر گیا تھا۔۔۔“

”اور تمہارے کپڑے کہاں گئے؟ تُم تو بالکل ننگے ہو۔۔۔!“

”کپڑے؟۔۔۔ ارے ہاں! راستے میں چوروں نے پکڑ لیا تھا۔ اور کُچھ تو میرے پاس تھا نہیں۔ کم بختوں نے کپڑے ہی اُتار لیے۔ بھائی ماہی گیر!

کیا تُم ترس کھا کر مُجھے ایک آدھ پھٹا پُرانا کپڑا دے دو گے ؟ دیکھو نا! اِس حالت میں گھر کیسے جا سکتا ہوں!"

مچھیرے نے کہا۔ "میرے پاس کپڑا تو کوئی فالتو نہیں۔ ہاں! یہ ایک چھوٹی سی بوری ہے۔ تُم لے سکتے ہو۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ ننگا رہنے سے یہی بہتر تھا کہ بدن پر بوری لپیٹ لی جائے۔ پنا کو نے بوری میں سوراخ کیے اور اُسے قمیص کی طرح پہن لیا۔ بوری پہن کر وہ کسی سرکس کا مسخرہ لگتا تھا۔

"اچھّا بھائی! آپ کا بہت بہت شکریہ! مُجھے ذرا جلدی ہے۔ خُدا حافظ!" اُس نے مچھیرے کو سلام کیا اور بستی کی طرف دوڑنے لگا۔

رات ہو گئی تھی۔ بستی میں گھُپ اندھیرا تھا۔ لوگ بستروں میں دُبکے میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ پری کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ پنا کو

کُچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ کھٹکھٹاؤں یا نہ کھٹکھٹاؤں! اُسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ پری کے سامنے کیا مُنہ لے کر جاؤں گا؟ وہ مُجھ سے پوچھے گی کہ دِن بھر کہاں رہے؟ تو کیا جواب دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے لڑائی کا پتہ چل گیا ہو اور وہ مُجھے ہی قصوروار سمجھتی ہو۔ اُسے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی، مگر جاتا بھی کہاں؟ صُبح کا بھوکا تھا اور آدھی رات کا وقت۔

آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر دم بارش کا دھڑکا تھا۔

اس نے ہمّت کر کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس پر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اب تو وہ بہت پریشان ہوا۔ آسمان پر بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔

پناکو نے مایوس ہو کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد کسی عورت نے کھڑکی کھولی اور غصّے سے بولی۔ ”کون ہے؟“

"پری صاحبہ اندر ہیں؟

"پناکو نے پوچھا۔

"وہ سو رہی ہیں۔ تُم کون

ہو؟"

"میں پناکو ہوں۔"

"پناکو کون۔۔۔؟"

"کٹھ پُتلا۔۔۔ جو اِس گھر میں رہتا تھا۔"

"یہ کون سا وقت ہے آنے کا؟ صُبح کو آنا۔۔۔" عورت نے کہا اور کھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔ اتنے میں زور سے بادل کڑکا اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پناکو دروازے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ سردی کے مارے دانت بج رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے

آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔ وہ کُچھ دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ پھر اُسے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

جب ہوش آیا تو وہ کمبلوں میں لپٹا، چارپائی پر لیٹا تھا۔ پری پلنگ کی پٹی سے لگی کھڑی تھی۔ اُسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہ آہستہ سے بولی۔ ”تمہارا علاج تو یہ تھا کر تمہیں باہر سردی ہی میں ٹھٹھر کر مرنے دیا جاتا، لیکن۔۔۔ مُجھے رحم آگیا۔“

”مُجھے معاف کر دیجیے۔ خُدا کے لیے معاف کر دیجیے۔ میں سچّے دِل سے توبہ کرتا ہوں۔ اب کسی کے بہکائے میں نہیں آؤں گا۔“ پنا کو نے سِسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”اچھّا! اِس دفعہ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔“ پری نے کہا۔ ”لیکن پھر کبھی ایسی حرکت کی تو یاد رکھنا، مُجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔“

پنا کو نے سچ مچ اپنا وعدہ پورا کر دِکھایا۔ وہ روز سیدھا اسکول جاتا اور چھٹّی کے بعد سیدھا گھر آتا۔۔۔ اُستاد بھی اُس سے خوش تھے اور پری بھی۔ اِس طرح پانچ چھ مہینے گزر گئے۔

ایک دِن پری نے اُسے اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے بولی۔ ”پیارے پنا کو! میں تُم سے بہت خوش ہوں۔ کل تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔“

”کون سی خواہش؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”کل تُم کٹھ پُتلے کے بجائے سچ مچ کے لڑکے بن جاؤ گے۔ گوشت پوست کے لڑکے، بالکل انسانوں کی طرح۔“

پنا کو کا مُنہ حیرت سے کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ وہ ایک منٹ تک گُم سُم بیٹھا رہا۔ پھر دیوانوں کی طرح کمرے میں ناچنے لگا۔

پری بولی۔ ”اِس خوشی میں کل ایک جشن منایا جائے گا۔ تُم اسکول کے لڑکوں سے کہہ آؤ کہ وہ کل شام کا کھانا تمہارے ساتھ کھائیں۔ مگر دیکھو شام سے پہلے پہلے گھر آ جانا۔“

پنا کو نے ایک گھنٹے کے اندر اندر تمام لڑکوں کو دعوت دے دی۔ اب صرف ایک لڑکا رہ گیا تھا۔ اس کا اصلی نام تو رومیو تھا مگر لمبا ہونے کی وجہ سے لڑکے اُسے لم ڈھینگ کہتے تھے۔ یہ بہت نکمّا اور شریر تھا۔ پڑھتا پڑھاتا خاک نہ تھا، اِس لیے ہمیشہ اُستادوں سے مار کھاتا۔ پنا کو اُسے بہت چاہتا تھا۔

لم ڈھینگ گھر پر نہیں تھا۔ اُس کی ماں نے بتایا کہ وہ صُبح سے غائب ہے۔ پتا نہیں، کہاں گیا ہے۔ پنا کو اُسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا بستی کے باہر نکل گیا۔ یہاں ایک کھیت کے کنارے چری کا ڈھیر لگا تھا۔ اس کے پیچھے لم ڈھینگ چھُپا بیٹھا تھا۔

پناکو اُدھر سے گزرا تو لم ڈھینگ نے اُسے آواز دی۔ پناکو نے حیرت سے کہا۔ ”ارے! یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔“ لم ڈھینگ نے جواب دیا۔ ”رات کی سیاہی پھیلتے ہی اِس بستی سے چلا جاؤں گا۔“

”کہاں جاؤ گے؟“ پناکو نے پوچھا۔

”بس، یہ مت پوچھو۔“ لم ڈھینگ خوشی سے ہاتھ مل کر بولا۔ ”ایک ایسے مُلک میں جا رہا ہوں جس کے سامنے جنّت بھی کُچھ نہیں۔“

”میں تمہارے گھر گیا تھا۔“ پناکو نے اُسے بتایا۔

”کیوں؟۔۔۔ خیریت تو ہے؟“

”ارے! تُم نے نہیں سُنا؟ کل میں سچ مچ کا لڑکا بن جاؤں گا۔ بالکل تمہاری طرح۔ اِس خوشی میں کل شام اسکول کے تمام لڑکوں کی دعوت ہے۔ تُم

بھی آنا!“

”مجھے افسوس ہے کہ میں نہ آسکوں گا۔“لم ڈھینگ نے کہا۔”آج رات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے جارہا ہوں۔“

”لیکن جا کہاں رہے ہو؟ اُس مُلک کا نام کیا ہے؟“

”اُس ملک کا نام ہے ’بے فکروں کی دُنیا‘ وہاں نہ کوئی اسکول ہے، نہ اُستاد اور نہ کتابیں۔ وہاں کوئی شخص کام نہیں کرتا۔ اتوار کے علاوہ سنیچر کو بھی چھٹّی ہوتی ہے۔ ہفتے میں چھ سنیچر ہوتے ہیں اور ایک اتوار۔ ہر سال جنوری کی پہلی تاریخ کو چھٹیاں شروع ہوتی ہیں اور دسمبر کی اکتیس تاریخ کو ختم ہوتی ہیں۔“

”یہ تو بڑا اچھّا ملک ہے۔“ پنا کو نے کہا۔

”تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔“لم ڈھینگ بولا۔

”نہیں نہیں۔ میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا ہے کہ میں اچھّا لڑکا بنوں گا۔ سورج ڈوبا چاہتا ہے، اب چلتا ہوں۔“

”ٹھہرو تو، چلے جانا۔ ایسی بھی کیا جلدی۔“ لم ڈھینگ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اکیلے ہی جا رہے ہو یا کوئی اور بھی ساتھ میں ہے؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”پچاس لڑکے اور بھی ہیں۔“

”پیدل جاؤ گے؟“

”نہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک گاڑی آئے گی۔ مُجھے سوار کرا کے چلے جانا۔“

”ماں ناراض ہو گی۔ مُجھے جانے دو۔ خُدا حافظ!“ پنا کو نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تمھاری مرضی۔ مگر یاد رکھو۔ ایسا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔" لم ڈھینگ نے کہا۔

پنا کو جاتے جاتے رُک گیا۔ اس نے پوچھا:

"تمھیں اِس بات کا پورا یقین ہے کہ اُس ملک میں کوئی اسکول نہیں؟"

"ایک اسکول بھی نہیں؟"

"اور نہ کوئی اُستاد ہے؟"

"اُستاد کا نام و نشان تک نہیں۔"

"وہاں تمام سال چھٹیاں رہتی ہیں؟"

"تمام سال۔۔۔"

”ہائے! کتنا پیارا ملک ہے۔۔۔! گاڑی کب آئے گی؟“

”بس آتی ہی ہو گی۔۔۔ تمہیں اگر جلدی ہے تو چلے جاؤ۔“

”نہیں۔ جہاں اتنی دیر ٹھہرا ہوں، تھوڑی دیر اور سہی۔“ پنا کو نے کہا۔ ”تمہیں سوار کرا کے چلا جاؤں گا۔“

سورج ڈوبے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔ اندھیرا بڑھا جا رہا تھا۔ اِتنے میں دُور سے چھن چھن گھنگھرو بجنے کی آواز آئی۔

”گاڑی آ رہی ہے۔“ لم ڈھینگ نے کہا۔ ”وقت بہت کم ہے۔ پھر سوچ لو۔ چلنا ہے یا نہیں؟“

پنا کو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ چند منٹ بعد گاڑی اُن کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ اُس کے آگے بارہ گدھے جتے تھے اور اسے ایک موٹا سا کوچوان چلا

رہا تھا۔

گاڑی بچّوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ سب کے سب 'بے فکروں کی دُنیا' میں جا رہے تھے، جہاں نہ کوئی اسکول تھا اور نہ اُستاد۔ کوچوان نے لم ڈھینگ سے کہا۔ "تمہارا ہی نام رومیو ہے؟ جلدی بیٹھو، دیر ہو رہی ہے۔"

لم ڈھینگ اُچک کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ کوچوان پناکو کی طرف مُڑا اور بولا۔ "لڑکے تُم نہیں جاؤ گے؟"

"جی نہیں۔ میں یہیں رہوں گا۔" پناکو نے جواب دیا۔

"پناکو! میری مانو۔ ضِد چھوڑو۔ بعد میں افسوس کرو گے۔" لم ڈھینگ نے کہا۔ "ذرا سوچو تو۔ یہاں تمہیں روز اسکول جانا پڑتا ہے۔ سبق یاد نہ کرو تو اُستاد کے ڈنڈے کھانے پڑتے ہیں۔ بے فکروں کی دُنیا میں کوئی اسکول

نہیں۔ وہاں تُم صُبح سے شام تک موج اڑاؤ گے۔ نہ پڑھائی کا ڈر اور نہ مار کا ڈر۔“

پنا کو نے ایک لمحہ سوچا اور پھر ایک دم گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل دی۔

۱۰

گاڑی رات بھر چلتی رہی اور دوسرے دِن پَو پھٹے، اُس مُلک کی سرحد میں داخل ہوئی جس کا نام لم ڈھینگ نے بے فکروں کی دُنیا بتایا تھا۔ یہ مُلک دُنیا کے تمام ملکوں سے نرِالا تھا۔ یہاں صرف لڑکے ہی لڑکے تھے۔ آٹھ

برس سے لے کے چودہ برس تک کے لڑکے۔ گلی کوچوں میں بھیڑ لگی ہوئی تھی اور بے فکروں کی ٹولیاں طرح طرح کے کھیل کھیل رہی تھیں۔ کہیں گلی ڈنڈا ہو رہا تھا تو کہیں آنکھ مچولی۔ ایک طرف کبڈی کی پالی جمی ہوئی تھی تو دوسری طرف پاؤں ٹکنی یا کیڑی کاڑا کھیلا جا رہا تھا۔ دو تین لڑکے سڑک کے بیچوں بیچ سر نیچے ٹانگیں اوپر کیے ہاتھوں کے بل چل رہے تھے اور دوسرے لڑکے تالیاں بجا بجا کر خوش ہو رہے تھے۔ غرض ہر طرف ایسی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

پنا کو اور لم ڈھینگ کی گاڑی بستی میں داخل ہوئی تو تمام لڑکے اُس کے گرد جمع ہو گئے اور اُنہوں نے نعرے لگا کر اُن کا استقبال کیا۔ نئے آنے والے جلد ہی بستی کے پرانے باسیوں سے گھُل مِل گئے اور اُن کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہو گئے۔

اسی طرح ہنستے کھیلتے دِن گُزرنے لگے۔ پنا کو جب بھی لم ڈھینگ سے ملتا تو اُس کا شکریہ ادا کرتا اور کہتا۔ ”میرے دوست! دوست ہو تو تم جیسا ہو۔ اگر تُم مجُھے یہاں نہ لاتے تو مجُھے عُمر بھر افسوس رہتا۔ ہائے! کتنا پیارا مُلک ہے یہ! نہ کوئی غم نہ فکر۔ ہر وقت بس کھیل ہی کھیل۔“

لم ڈھینگ مُسکرا کر جواب دیتا۔ ”تُم تو یہاں آنا نہیں چاہتے تھے۔ مجُھے دُعائیں دو کہ تمھیں بہلا پھسلا کر لے آیا۔ ورنہ تُم تو وہیں کتابوں میں سر کھپا رہے ہوتے۔ صُبح کو اُٹھتے، ناشتا کرتے اور اسکول چلے جاتے۔ وہاں اُستادوں کے ڈنڈے کھاتے اور منہ بسورتے گھر آ جاتے۔ پھر صُبح ہوتی اور وہی قصّہ دہرایا جاتا۔۔۔“

”یار! کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں!“ پنا کو کہتا۔ ”اُستاد کہتے تھے کہ لم ڈھینگ بہت خراب لڑکا ہے۔ اُس سے بچ کر رہنا۔ یہ تمھیں بھی خراب کر دے گا۔ اب مجُھے معلوم ہوا کہ وہ غَلَط کہتے تھے۔ تُم میرے

سچّے دوست اور خیر خواہ ہو۔"

جب آدمی خوش ہو تو پتا بھی نہیں چلتا کہ کب دِن ہوا اور کب رات آئی اور دُکھی ہو تو دِن کاٹے نہیں کٹتے۔ ایک ایک منٹ ایک ایک سال بن جاتا ہے۔ پنا کو کو نہ اسکول کی فکر تھی اور نہ اُستادوں کی ڈانٹ ڈپٹ کا دھڑکا۔ اپنی نیند سوتا، اپنی بھوک کھاتا۔ جہاں مرضی چاہی چلے گئے اور جب دِل چاہا واپس آ گئے۔ نہ کوئی پوچھنے والا کہ کہاں گئے تھے اور نہ یہ معلوم کرنے والا کہ اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ ہر روز عید اور ہر شب، شب برات۔ اِس طرح پانچ مہینے چُپ چپاتے گزر گئے مگر پنا کو کو ایسا لگتا تھا جیسے کل ہی آیا ہو۔

اور پھر ایک دِن بڑی ہی عجیب بات ہوئی۔ صُبح کو پنا کو سو کر اُٹھا اور اُس نے انگڑائی لے کر سر کھُجایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے کان ہاتھ سے بھی زیادہ لمبے ہو گئے ہیں۔ اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ "یا اللہ!

رات تو وہ بھلا چنگا سویا تھا، یہ راتوں رات کیا ہو گیا؟"

کمرے میں آئینہ نہیں تھا۔ اُس نے ایک بڑے سے پیالے میں پانی بھرا اور اُس میں اپنی شکل دیکھی۔ وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اُس کے اپنے کان تو خُدا جانے کہاں غائب ہو گئے تھے اور اُن کی جگہ گدھے جیسے لمبے لمبے کان اُگ آئے تھے۔ وہ کُچھ دیر تو تعجّب سے اپنی عجیب غریب صورت دیکھتا رہا اور پھر دیوانوں کی طرح چیخیں مار مار کر دیواروں سے سر پھوڑنے لگا۔

کمرے میں ایک چوہا بھی رہتا تھا۔ چیخیں سُن کر وہ بل میں سے نکل آیا اور بولا۔ "پناکو بھائی! خیر تو ہے؟ کیا ہوا؟"

پناکو بولا۔ "ہائے ہائے۔۔۔! بس کُچھ نہ پوچھو۔"

چوہے نے کہا۔ "بتاؤ تو سہی، ہوا کیا؟"

پناکو بولا۔ ”تمہیں نبض دیکھنی آتی ہے؟“

”کُچھ کُچھ آتی تو ہے۔“

”ذرا دیکھو تو۔۔۔ مجُھے کوئی بیماری تو نہیں؟“ پناکو نے ہاتھ آگے کیا۔

چوہے نے اپنے پنجے سے پناکو کی نبض چھوئی اور بولا۔ ”او ہو! پناکو بھائی! یہ تو غضب ہو گیا!“

”کیا ہوا؟“ پناکو نے گھبرا کر پوچھا۔

”تمہیں بڑا ہی خطرناک بُخار ہے۔“

”کون سا بُخار؟۔۔۔ گردن توڑ یا گھٹنا توڑ؟“

”یہ بُخار اِن دونوں بُخاروں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اِسے ’گدھا بُخار‘ کہتے ہیں اور جس آدمی کو یہ بُخار آتا ہے، وہ گدھا بن جاتا ہے۔ کُچھ دیر بعد تُم گدھا بن جاؤ گے اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے پھرو گے۔“

"ہائے، میرے اللہ! ہائے، میرے ابّا! ہائے، میری امّاں! اب کیا کروں؟" پنا کو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

چوہا بولا۔ "اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو لڑکے پڑھنے لکھنے سے نفرت کرتے ہیں، اُنھیں اللہ میاں گدھا بنا دیتا ہے۔"

"پیارے بھائی! خُدا کے لیے کوئی ترکیب بتاؤ کہ اِس مُصیبت سے چھوٹوں۔" پنا کو نے اُس کی منّت کی۔

چوہا بولا۔ "بیماری بہت بڑھ گئی ہے۔ اب کوئی دوا کام نہیں کرے گی۔ تمھیں اپنا بُرا بھلا پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"اس میں میرا قصور نہیں۔" پنا کو نے کہا۔ "یہ شرارت اُس نامعقول لم ڈھینگ کی ہے۔ وہی مُجھے بہکا کر یہاں لایا تھا۔"

”لم ڈھینگ کون ہے؟“ چوہے نے پوچھا۔

”وہ میرا اہم جماعت تھا۔ اُس نے مُجھے سبز باغ دِکھائے اور کہا کہ پڑھنے لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تُم میرے ساتھ بے فکروں کی دُنیا میں چلو، عیش کرو گے۔ کاش، میں گھر پر ہی رہتا۔ روز اسکول جاتا اور دِل لگا کر پڑھتا تو آج سچ مچ کا لڑکا بن گیا ہوتا۔ ٹھہرو! میں ابھی جا کر اُس لم ڈھینگ کے بچّے کو مزا چکھاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا مگر پھر فوراً ہی اُسے اپنے کان یاد آئے۔ اُس نے سوچا، ایسی حالت میں باہر جاؤں گا تو دیکھنے والے مذاق اُڑائیں گے۔ سوچتے سوچتے اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے جلدی جلدی ایک بڑی سی ٹوپی بنائی اور اُسے اوڑھ کر دونوں کان اُس کے اندر چھُپا لیے۔

اب وہ لم ڈھینگ کے گھر پہنچا۔

دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز

آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں پناکو۔ دروازہ کھولو۔“

”ذرا ٹھہرو۔۔۔ ابھی کھولتا ہوں۔“ لم ڈھینگ نے جواب دیا۔

آدھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا۔ پناکو کو یہ دیکھ حیرت ہوئی کہ لم ڈھینگ نے بھی ویسی ہی ایک ٹوپی اوڑھ رکھی ہے اور اُس کے اندر اُس کے دونوں کان چھُپے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ پناکو کو تسلّی ہوئی۔ اُس نے دِل میں سوچا، ”چلو، یہ اچھّا ہوا۔ جو بیماری مُجھے لگی ہے، اِسے بھی لگ گئی ہے۔“ لیکن وہ ایسا بن گیا جیسے کُچھ دیکھا ہی نہیں۔ مُسکرا کر بولا۔ ”سُناؤ یار! لم ڈھینگ۔ کیا حال ہے؟“

”بہت اچھّا۔“ لم ڈھینگ نے ہنس کر کہا۔ ”بس، یوں سمجھو، جنّت کے مزے آرہے ہیں۔“

”سچ مچ؟ یا یونہی میرا دِل رکھنے کو کہہ رہے ہو؟“

”یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟“ لم ڈھینگ نے پوچھا۔

”تُم نے اتنی بڑی ٹوپی کیوں منڈھ رکھی ہے سر پر؟“

”بات یہ ہے میرے گھُٹنے میں درد تھا۔ ڈاکٹر نے کہا یہ ٹوپی اُوڑھ لو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے، لیکن تُم بھی تو ایسی ہی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہو۔ تمہیں کیا ہوا؟“

”میرے پیر میں موچ آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔۔۔“

”یار! یہ ٹوپی تو جادُو کی ہے۔ جب سے اوڑھی ہے، درد ورد سب غائب ہو گیا ہے۔“

"سچ مچ۔۔۔؟" پناکو نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

لم ڈھینگ نے گھبرا کر مُنہ پھیر لیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"ایک بات بتاؤ، یار!" پناکو نے آہستہ سے پوچھا۔ "تمھیں کانوں کی بیماری کبھی ہوئی تھی؟"

"نہیں تو،۔۔۔ تمھیں ہوئی تھی؟"

"نہیں۔" پناکو نے کہا۔ "لیکن آج صُبح سے ایک عجیب سی بیماری لگ گئی ہے۔"

"یار! یہی حال میرا بھی ہے۔" لم ڈھینگ بولا: "کل رات میں اچھّا خاصا سویا تھا۔ صُبح اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ۔۔۔"

"ذرا ٹوپی تو اُتارو۔" پناکو نے کہا۔

"نہیں۔ پہلے تُم اُتارو۔" لم ڈھینگ بولا۔

بہت دیر تک دونوں "پہلے آپ۔ پہلے آپ" کرتے رہے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں ایک ساتھ اُتاریں۔ پنا کو نے ایک، دو، تین کہا اور تین پر دونوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اُتار کر فرش پر پھینک دیں۔

ٹوپیوں کا اُترنا تھا کہ دونوں کے گدھے جیسے کان کھڑے ہو کر لہرانے لگے۔ بجائے اِس کے کہ وہ شرمندہ ہوتے، اُنھوں نے ایک دوسرے کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا اور ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔

اچانک لم ڈھینگ خاموش ہو گیا اور چلّا کر بولا۔ "بچاؤ۔۔۔! خُدا کے لیے مُجھے بچاؤ۔"

"کیا ہوا۔۔۔؟" پنا کو نے پوچھا۔

"میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میں گِرا جا رہا ہوں۔"

"ارے رے رے! میری ٹانگیں بھی مُڑ رہی ہیں۔" پنا کو نے کہا۔

ایکا ایکی دونوں نیچے گر پڑے اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل کمرے میں دوڑنے لگے۔ بالکل ایسے جیسے چوپائے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کی صورت بدلنے لگی۔ پہلے جسم پر لمبے لمبے بال اُگے۔ پھر بازو اور پیر سخت ہو کر موٹے ہو گئے۔ ہاتھوں کے بجائے کھُر نکل آئے۔ چہرا لمبوترا ہو گیا۔ اِس کے بعد ایک لمبی سی دُم بھی نکل آئی۔ اب اُن میں اور گدھوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور پھر مُنہ اُوپر اُٹھایا اور بولے:

”ڈھینچوں۔۔۔ڈھینچوں۔۔۔ڈھینچوں۔۔۔!“

۱۱

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور کِسی نے زور سے کہا۔ ”دروازہ کھولو!“ یہ اُسی کوچوان کی آواز تھی جو پنا کو اور لم ڈھینگ کو یہاں لایا تھا۔

پنا کو اور لم ڈھینگ تو گدھے بن چکے تھے۔ وہ دروازہ کیسے کھولتے؟

دونوں زور زور سے چیخنے لگے۔ ”ڈھینچوں۔ ڈھینچوں۔“ کوچوان نے کُچھ دیر تو انتظار کیا۔ پھر اتنی زور کا دھکّا دیا کہ دروازہ ٹوٹ گیا۔

کوچوان نے اندر آ کر پنا کو اور لم ڈھینگ کو گدھے کی شکل میں دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ بولا۔ ”میں نے تمھاری آواز پہچان لی تھی۔ تُم بہت اچھّا رینکتے ہو۔ اب چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں منڈی لے جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے کنگھی اور برش نکالا اور دونوں کی خوب صفائی کی۔ پھر اُن کے جسم پر تھوڑا تھوڑا تیل ملا جس سے اُن کے بال آئینے کی طرح چمکنے لگے۔ اِس کے بعد وہ اُنہیں جانوروں کی منڈی میں لے گیا۔ اتنے اچھّے گدھے دیکھ کر دھڑا دھڑ گاہک آنے لگے اور منٹوں میں دونوں کا سودا ہو گیا۔

لم ڈھینگ کو ایک کمہار نے خرید لیا۔ اُس کا پہلا گدھا بوجھ ڈھوتے

ڈھوتے مر گیا تھا۔ پناکو کو سرکس کے منیجر نے خریدا۔ سرکس والا بہت خرانٹ تھا۔ وہ پناکو کو دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ بہت ہوشیار اور عقل مند گدھا ہے۔ میں اِسے کرتب سکھا کر خوب پیسے کماؤں گا۔

اب تُم سمجھ گئے ہوگے کہ اُس کوچوان کا کیا دھندا تھا۔ یہ شخص بستی بستی گاڑی لے کر پھرتا تھا۔ جہاں کوئی کام چور اور نکمّا لڑکا دیکھتا، اُسے سبز باغ دِکھا کر "بے فکروں کی دُنیا" میں لے آتا۔ یہاں یہ بچّے نکمّے پڑے رہتے تھے اور آخر ایک دِن گدھے بن جاتے اور تب کوچوان اُنہیں منڈی میں بیچ آتا۔ اِس طرح وہ بہت امیر بن گیا تھا۔

لم ڈھینگ پر کیا گزری؟۔۔۔ یہ ہمیں پتا نہیں۔ پناکو کی سُنو۔ سرکس کا منیجر پناکو کو اپنے ساتھ لے آیا اور اُسے دُوسرے جانوروں کے ساتھ ایک طویلے میں باندھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوکر پناکو کے آگے ایک ناند رکھ گیا جس میں سوکھی گھاس تھی۔ پناکو کو بڑے زور کی بھوک لگی

تھی۔ اس نے تھوڑی سی گھاس منہ میں لے کر چبائی تو اُسے اُلٹی آ گئی اور اُس نے گھاس تھوک دی۔

منیجر کو بہت غصّہ آیا۔ اُس نے کہا۔ ''گھاس نہیں کھائے گا تو کیا لڈّو پیڑے کھائے گا؟۔۔۔ ٹھہر تو جا۔۔۔ ابھی خبر لیتا ہوں!'' یہ کہہ کر اُس نے کوڑا اُٹھایا اور اب جو پنا کو کو دُھنا شروع کیا ہے تو بے چارے کو نانی یاد آ گئی۔ اُس نے ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

منیجر مارتے مارتے تھک گیا تو ٹھہر گیا۔ کہنے لگا: ''میں دیکھوں گا تُو کیسے گھاس نہیں کھاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

رات ہو گئی تھی۔ دوسرے جانور دانہ گھاس کھا کر سو گئے تھے۔ پنا کو صُبح کا بھوکا تھا۔ اُسے غش آ رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید انسانوں والا کوئی کھاجا مل جائے مگر ہر طرف گھاس ہی گھاس پڑی تھی۔ آخر

جب صبر نہ ہوا تو مجبوراً گھاس ہی کھانے لگا۔ بھوک میں اُسے گھاس بھی ایسی معلوم ہوئی جیسے لڈّو پیڑے۔

دوسرے دِن صُبح کو منیجر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ پنا کو نے گھاس کھالی ہے تو بہت خوش ہوا۔ بولا۔ "بیٹا! کھاؤ گے نہیں تو سرکس میں کام کیسے کرو گے؟ اب چلو، آج سے تمہاری تعلیم شروع ہو گی۔ میں تمہیں ناچنا، گانا اور رسّی پھلانگنا سکھاؤں گا۔ اگر تُم نے میرا کہا مانا اور جی لگا کر کرتب سیکھے، تب تو ٹھیک ورنہ مار مار کر بھُرکس نکال دوں گا۔"

اس دِن سے منیجر پنا کو کو کرتب سکھانے لگا۔ اگر وہ غَلَطی کرتا یا کوئی بات بھول جاتا تو اُس کی خوب پٹائی ہوتی۔ اِس طرح تین مہینے گُزر گئے۔ اب پنا کو اپنے کام میں خوب ماہر ہو گیا تھا۔ وہ بینڈ کی دُھن پر اگلے پیر اُٹھا کر بالکل انسانوں کی طرح ناچتا۔ لوہے کے حلقے میں سے صاف نکل جاتا اور اپنے قد سے اُونچی رسّی بھی آسانی سے پھلانگ جاتا۔ منیجر اُس سے بہت

خوش تھا اور اُسے ہری ہری نرم گھاس کھانے کو دیتا تھا۔

پناکو کے ساتھ دوسرے جانور بھی طرح طرح کے کرتب سیکھ رہے تھے۔ جب وہ بھی اپنے اپنے کاموں میں خوب ماہر ہو گئے تو سرکس کے منیجر نے شہر میں بڑے بڑے اشتہار لگوائے کہ فلاں تاریخ کو تماشا ہو گا جس میں گھوڑے، ہاتھی، بندر، ریچھ اور گدھے وغیرہ اپنے کمال دکھائیں گے۔

تماشا شروع ہوا تو سرکس تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اُن میں بچّے بھی تھے اور جوان اور بوڑھے بھی۔ ہر شخص بڑی بے چینی سے تماشا شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر بینڈ بجنا شروع ہوا۔ پہلے مختلف آدمیوں نے اپنے اپنے کام دِکھائے۔ پھر جانوروں کی باری آئی۔ جب گھوڑے، ہاتھی اور بندر وغیرہ بھی تماشا دِکھا کر چلے گئے تو اب میاں پناکو آئے۔ اُس کے اوپر بڑی خوب صورت جھول پڑی ہوئی تھی اور پیروں

میں گھنگھرو بندھے تھے۔ منیجر ہاتھ میں کوڑا لیے پیچھے پیچھے تھا۔

منیجر نے کوڑے کو جھٹکا دیا اور بولا۔ "ہاں، بھئی! پنا کو۔۔۔! سب سے پہلے تماشائیوں کو سلام کرو۔"

پنا کو نے جلدی سے اگلے پیروں پر جھک کے زمین پر ماتھا ٹیک دیا۔ تماشائیوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

منیجر نے کوڑا پھٹکارا اور بولا۔ "شاباش۔۔۔! اب ناچ دِکھاؤ۔"

بینڈ بجنے لگا اور پنا کو اُس کی دُھن پر اگلے پیر اُٹھا کر ٹھمک ٹھمک ناچنے لگا۔ دیکھنے والے ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بنے جا رہے تھے۔ ناچتے ناچتے پنا کو نے سر جو اُٹھایا تو تماشائیوں کے درمیان اُسے ایک جانی پہچانی صورت دِکھائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹھمک ٹھمک کرتا اور آگے بڑھا اور اب جو غور سے دیکھا تو وہ پری تھی۔

پری کو دیکھ کر وہ ناچنا واچنا سب
بھُول گیا اور چیخیں مارنے لگا۔
"ڈھینچوں ڈھینچوں۔"
تماشائی سمجھے، یہ بھی کوئی مذاق کی
بات ہے۔ وہ اور زور زور سے ہنسنے
لگے۔ منیجر نے غصّے سے کہا۔ "پنا کو
ناچو۔۔۔!" مگر پنا کو ٹکٹکی باندھے پری کو تک رہا تھا اور اُس کے مُنہ سے
ڈھینچوں ڈھینچوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

منیجر غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے ڈنڈے سے پنا کو کو اتنا پیٹا کہ
وہ غش کھا کر گر گیا۔ سرکس کے ملازم اُسے اُٹھا کر ایک خیمے میں ڈال
آئے۔ دوسرے دِن منیجر پنا کو کے پاس آیا۔ وہ بہت غصّے میں تھا۔ پنا کو
نے اُس کا سارا تماشا خراب کر دیا تھا۔ منیجر نے پنا کو کے ٹھوکر ماری اور

کڑک کر بولا: "اُٹھ۔۔۔!"

پنا کو درد سے کراہتا ہوا اُٹھا مگر فوراً ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ منیجر نے دو تین لاتیں اور جڑ دیں لیکن پنا کو ہلا تک نہیں۔ زمین پر پڑے پڑے واویلا مچاتا رہا۔

منیجر سمجھا کہ پنا کو کو زیادہ چوٹ لگ گئی ہے۔ اُس نے جانوروں کے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے پنا کو کا معائنہ کیا اور بولا۔ "اِس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ یہ عُمر بھر کے لیے لنگڑا ہو گیا ہے۔"

یہ سُن کر منیجر نے ایک نوکر سے کہا۔ "یہ گدھا ہمارے کام کا نہیں رہا۔ اِسے منڈی میں بیچ آؤ۔"

نوکر پنا کو کو گھسیٹتا ہوا منڈی لے گیا۔ گاہک اُسے دیکھتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے اور کوئی پاس تک نہ پھٹکتا۔ آخر شام کے وقت ایک گاہک آیا اور

اُس نے دام پوچھے۔ نوکر نے کہا۔ "دس روپے۔"

گاہک بولا۔ "اِس لنگڑے گدھے کے دس روپے؟ یہ کس کام کا ہے؟ میں تو اِس کی کھال کا ڈھول بناؤں گا۔ دو روپے لینے ہیں تو لے لو۔"

پناکو نے یہ سُنا تو اُس کی جان نکل گئی۔ اُس نے چیخنا شروع کر دیا۔ "ڈھینچوں ڈھینچوں۔"

نوکر نے سوچا کب تک کھڑا رہوں گا۔ صُبح سے یہی ایک گاہک آیا ہے۔ چلو دو روپے ہی بہت ہیں۔ اُس نے پناکو کی رسّی گاہک کو تھما دی اور روپے جیب میں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

گاہک پناکو کو کھینچتا ہوا دریا کے کنارے لے گیا۔ وہاں اُس نے پناکو کی کمر سے ایک بڑا سا پتھّر باندھا۔ گلے میں بندھی ہوئی رسّی ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی اور اُس کو دریا میں دھکّا دے دیا۔ پناکو نے باہر نکلنے کی بہتیری

کوشش کی مگر کمر سے بھاری پتھّر بندھا ہوا تھا، اُس کے بوجھ سے وہ پانی میں ڈوب گیا۔

گاہک اطمینان سے کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب گدھا ڈوب کر مر جائے گا تو وہ باہر نکال کر اُس کی کھال اُتارے گا۔

۱۲

دس منٹ گزر گئے۔ آدمی نے سوچا اب گدھا مر گیا ہو گا؟ اُس نے رسّی کھینچنی شروع کی۔ کھینچتے کھینچتے رسّی کا آخری سِرا آیا تو وہ حیرت سے اُچھل

پڑا۔ رسّی میں گدھے کے بجائے ایک کٹھ پُتلا بندھا کلبلا رہا تھا۔ یہ پنا کو تھا۔ آدمی نے جلدی سے آنکھیں ملیں۔ وہ سمجھا، کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جب ذرا کُچھ اوسان درست ہوئے تو اس نے پنا کو سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔وہ گدھا کہاں گیا؟ اور تُم کون ہو؟"

"میں ہی تو وہ گدھا ہوں۔" پنا کو نے ہنس کر کہا۔

پنا کو کی ہنسی سے آدمی کے تن بدِن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصّے سے بولا۔ "مذاق کرتا ہے۔ سچ سچ بتا یہ کیا ماجرا ہے! ورنہ مار جوتوں کے بھُرکس نکال دوں گا۔"

پنا کو بولا۔ "جناب! آپ ناحق خفا ہو رہے ہیں۔ میں مذاق نہیں کرتا، سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مگر تو کٹھ پُتلا کیسے بن گیا؟"

”شاید یہ سمندر کے کھاری پانی کا اثر ہے۔“

”دیکھ! مذاق نہ کر۔ ورنہ مُجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔“

”آپ سچ بات جاننا چاہتے ہیں؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔!“ آدمی نے کہا۔

”تو پھر رسّی کھول دیجیے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ پنا کو نے کہا۔

آدمی کو اِس بات پر بڑی حیرت تھی کہ گدھا کٹھ پُتلا کیسے بن گیا۔ اُس نے جلدی سے رسی کھولی۔ پنا کو آزاد ہو گیا۔ اُس نے پہلے تو کُچھ دیر اپنے ہاتھ پاؤں سہلائے جو اتنی دیر بندھے رہنے کی وجہ سے درد کرنے لگے تھے، پھر زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور شروع سے لے کر اپنے گدھا بننے تک کی پوری داستان کہہ سُنائی۔

”بڑی عجیب کہانی ہے۔“ آدمی تھوڑی کھُجا کر بولا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر آپ نے مُجھے خرید لیا اور۔۔۔“

”تمھیں میں نے دو روپے میں خرید ا تھا۔“ آدمی بولا۔ ”یہ دو روپے حرام موت گئے۔“

”آپ نے مُجھے اِس لیے خرید ا تھا کہ میری کھال کا ڈھول بنائیں؟“ پنا کو نے پوچھا۔

”ہاں! لیکن اب میں تمہاری کھال کیسے اُتاروں، تُم تو نری لکڑی ہی لکڑی ہو۔“

”کوئی بات نہیں۔ دُنیا میں بہت سے گدھے ہیں۔ میں نہ سہی اور سہی۔“

”لیکن تُم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تُم گدھے کیسے بن گئے؟“ آدمی نے پوچھا۔

”یہ بات بتانے کی تو نہیں لیکن خیر! آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ یہ سب ایک

پری کی کرامت ہے۔"

"پری کی۔۔۔؟" آدمی حیرت سے بولا۔

"جی ہاں، پری کی۔ وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی ہے لیکن افسوس، میں نے اُسے بہت دُکھ دیے ہیں۔ میں نے کبھی اُس کا کہا نہیں مانا اور آج اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

"پری نے تمہیں گدھے سے کٹھ پُتلا کیسے بنایا؟" آدمی نے پوچھا۔

"جب آپ نے مجھے سمندر میں پھینکا تو پری کو پتا چل گیا۔ اس نے فوراً مچھلیوں کی ایک فوج بھیج دی۔ مچھلیوں نے آتے ہی میرا گوشت کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام گوشت ختم ہو گیا اور صرف ہڈّیاں یعنی لکڑیاں ہی رہ گئیں۔ میں بہت سخت لکڑی کا بنا ہوا ہوں۔ جُونہی مچھلیوں کے دانت لکڑی پر لگے۔ اُنھوں نے بُرا سا مُنہ بنایا اور بھاگ

گئیں۔ اِس کے بعد آپ نے مُجھے اوپر کھینچ لیا۔"

"تُم سمجھتے ہو، میں اِس بے ہودہ کہانی پر یقین کرلوں گا۔" آدمی نے کہا۔ "میں نے دو روپے خرچ کیے ہیں۔ میں تمہیں کسی ٹال والے کے ہاں بیچ دوں گا۔ تمہاری لکڑی بہت اچھّی ہے۔ کُچھ تو پیسے ملیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں اِسی لائق ہوں۔ آیئے چلیں۔" پِناکو نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

آدمی بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جُونہی اُس نے پِناکو کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ اُس نے ایک دم سمندر میں چھلانگ لگادی اور آن کی آن میں تیرتا ہوا دُور نکل گیا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اُسے سامنے سے ایک پہاڑ سا حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ ایک وہیل مچھلی تھی اور اُس کی طرف آرہی تھی۔ اُسے

دیکھتے ہی پنا کو کے ہوش اُڑ گئے اور وہ پھُرتی سے پیچھے مُڑا مگر وہیل آناً فاناً اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے مُنہ کھُول کر زور سے سانس لی اور پنا کو تنکے کی طرح اُڑ کر اُس کے پیٹ میں پہنچ گیا۔
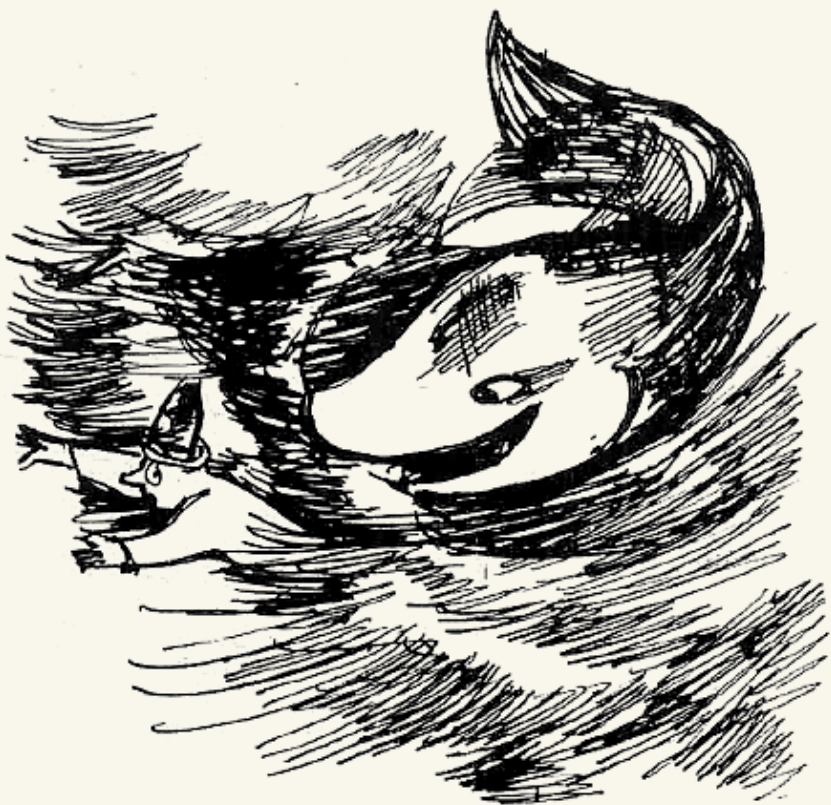
یہ سب کُچھ اِتنی تیزی سے ہوا کہ پنا کو سوچ بھی نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہوش ٹھکانے ہوئے تو اُس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولا کہ شاید باہر نکلنے کا کوئی راستہ مل جائے لیکن ساری کوششیں بے کار گئیں۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ میں باہر نہیں نکل سکتا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اچانک کہیں سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں پناکو۔“ پناکو نے کہا۔

”آپ کون ہیں؟“

”میں ایک ایل مچھلی ہوں۔ مُجھے ابھی ابھی اِس دیو نے نِگلا ہے۔ تُم کون سی مچھلی ہو؟“

”میں مچھلی نہیں ہوں۔“ پناکو نے جواب دیا۔ ”میں ایک کٹھ پُتلا ہوں۔ میری پیاری ایل مچھلی! خُدا کے لیے یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب بتاؤ۔“

”میں جانتی تو تُم سے پہلے خُود نکلتی۔ چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ تھوڑی دیر میں یہ دیو ہم دونوں کو ہضم کر جائے گا۔“

”میں مرنا نہیں چاہتا۔“ پناکو بولا۔

”میری قسمت میں تو مرنا ہی لکھا ہے۔“ مچھلی نے کہا۔

”یہاں نہیں مری تو کوئی شکاری پکڑ لے جائے گا اور مُجھے بھُون کر کھا جائے گا۔ میرے خیال میں اُس مرنے سے مرنا اچھّا۔“

”تمہاری مرضی۔“ پناکو نے کہا۔ ”میں تو بھاگنے کی کوشش کروں گا۔“

”بھاگ سکو تو بھاگ جاؤ۔ میں روکتی تھوڑی ہوں۔“

”کیا یہ وہیل بہت بڑی ہے؟“

”ایک میل سے کیا کم ہو گی؟“

”آؤ، اِس کے پیٹ میں سوراخ کریں۔“ پنا کو نے کہا۔

مچھلی بولی۔ ”میرے پاس برما نہیں۔ نہ چاقو ہی ہے۔“

”افسوس! اب کیا ہو گا؟“ پنا کو نے ہاتھ مل کر کہا۔

اچانک اُسے دُور فاصلے پر ہلکی سی روشن ٹمٹماتی دِکھائی دی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”ارے! یہ روشنی کیسی ہے؟“

”سمندر میں قسم قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔“ ایل مچھلی نے کہا۔ ”اِن میں ایسی مچھلیاں بھی ہیں جن کے بدن سے روشنی نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِس وہیل نے کوئی ایسی ہی مچھلی نِگل لی ہے۔“

”اس سے پوچھوں، شاید وہ کوئی تدبیر بتا دے۔“ پنا کو نے کہا۔

”اگر وہ جانتی تو خود کیوں نہ نکل جاتی؟ خیر، تمہاری مرضی، جا کر پُوچھ لو۔ خُدا تمہیں کامیاب کرے۔“

”خدا حافظ! بی مچھلی!“ پنا کو نے کہا اور اندھیرے میں ٹٹولتا، گرتا پڑتا اُس روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔

۱۳

جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا، روشنی تیز ہوتی گئی اور جب وہ قریب پہنچا تو مارے حیرت کے اُس کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ سامنے ایک میز پڑی تھی۔

میز پر موم بتّی جل رہی تھی۔ پاس ہی کرسی رکھی تھی اور اُس کرسی پر گیپیتو بیٹھا تھا۔۔۔پنا کو کا باپ۔

پنا کو کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ روئے، چیخے یا قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ کُچھ دیر تو یونہی دیوانوں کی طرح اُسے گھورتا رہا، پھر ایک دم ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا اور گیپیتو سے چمٹ گیا۔

"ابّا۔۔۔! ہائے ابّا! تُم کہاں چلے گئے تھے۔" سِسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہارے لیے دُنیا کا کونہ کونہ چھان مارا۔۔۔ ابّا۔۔۔! پیارے ابّا!"

گیپیتو کی بھی بُری حالت تھی۔ وہ بھی زار و قطار رو رہا تھا۔ آخر جب رو دھو کر باپ بیٹے کا جی ہلکا ہوا، دِل کا غُبار نِکلا تو اب اُنھوں نے اپنی اپنی کہانی سُنانی شروع کی۔ پنا کو پر جو کُچھ گزری تھی وہ اُس نے ایک ایک کر کے بتا

دی۔ گپیتو نے اُسے بتایا کہ جب کشتی میں سوار ہوا تو تھوڑی دیر بعد طوفان آگیا اور اُس کی کشتی ڈوب گئی۔

"پھر میرے بچّے!" گپیتو بولا۔ "یہ وہیل مچھلی اِدھر آ نِکلی اور اِس نے مُجھے نِگل لیا۔ اب میں یہاں دو سال سے ہوں۔"

"لیکن اتنا عرصہ آپ زندہ کیسے رہے؟" پنا کو نے پُوچھا۔ "کھانا کہاں سے کھاتے ہیں اور یہ موم بتّیاں وغیرہ کہاں سے آئیں؟"

گپیتو نے کہا۔ "جس طوفان نے میری کشتی ڈبوئی تھی، اُسی طوفان میں گِھر کر ایک تجارتی جہاز بھی ڈوبا تھا۔ اُس میں بہت سا سامان بھی تھا۔ وہ سب سامان بھی یہ مچھلی نِگل گئی۔ اُسی میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں تھیں۔ انہی کے سہارے میں زندہ رہا۔ لیکن۔۔۔ آہ! آج یہ سب سامان ختم ہو گیا اور یہ موم بتّی بھی بس آخری ہے۔"

”پھر تو ہمیں فوراً ہی یہاں سے نِکلنے کی کوئی تجویز سوچنی چاہیے۔“ پنا کو نے کہا۔

”میرے بچّے! اِس دیو کے پیٹ میں سے نکلنا ناممُکن ہے۔“ گیپیتو بولا۔

”کوئی چیز ناممُکن نہیں ابّا جان!“ پنا کو نے کہا۔ ”جِس راستے سے ہم یہاں آئے ہیں، اُسی راستے سے ہم باہر نِکل سکتے ہیں۔“

”لیکن میں تیرنا نہیں جانتا۔“ گیپیتو بولا۔

”فکر نہ کیجیے، آپ میری پیٹھ پر بیٹھ جانا۔ میں آپ کو کنارے پر لے جاؤں گا۔ وہیل سو رہی ہے۔ یہ موقع بہت اچھّا ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے موم بتّی اُٹھا لی اور بولا۔ ”آیئے، میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔“

دونوں باپ بیٹے، چُپ چاپ، سانس روکے، دبے دبے قدم اُٹھاتے

وہیل کے مُنہ کی طرف بڑھے۔ وہیل بوڑھی تھی۔ اُس کے پھیپھڑے کمزور تھے، اِس لیے وہ مُنہ کھول کر سوتی تھی۔

وہ دونوں تھوڑی دور آگے بڑھے تو اُنہیں ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی چاند کی تھی جو وہیل کے مُنہ کے راستے اندر آرہی تھی۔

"وہیل بے خبر سورہی ہے۔" پنا کو نے آہستہ سے کہا۔ "سمندر پُر سکون ہے۔ چاندنی بھی چھٹکی ہوئی ہے، اِس سے اچھّا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔ ذرا جلدی چلیے۔ ایسا نہ ہو، وہ جاگ جائے۔"

اب وہیل کا مُنہ آگیا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ اُس کی زبان پر چلتے ہوئے مُنہ کے سِرے پر پہنچے۔ پنا کو نے کہا۔ "میری کمر مضبوطی سے پکڑ لیجئے۔" گیپیتو نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کمر پکڑ لی اور پنا کو نے ایک دم سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

پنا کو تیر تا ہوا بہت دُور نکل آیا لیکن کنارا دِکھائی نہ دیا۔ گپیتو اُس کی پیٹھ پر چمٹا بیٹھا تھا۔ پنا کو کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کانپ رہا ہے۔ اُس نے باپ کی ہمّت بندھائی۔ ''گھبرایئے نہیں ابّا جی! کنارا آیا ہی چاہتا ہے۔''

''کہاں بیٹے؟'' گپیتو نے آہ بھر کر کہا۔ ''مجُھے تو کوسوں تک زمین نظر نہیں آتی۔''

پنا کو نے کہا۔ ''آپ کی نظر کمزور ہے ابّا جی۔۔۔! بُوڑھے جو ہو گئے ہیں۔ میری نگاہ بہت تیز ہے۔ وہ دیکھیے۔ وہ رہا کنارا۔۔۔ وہ بائیں طرف۔'' اُس نے ایک طرف یونہی اشارہ کر دیا۔ حال آں کہ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کنارے کا نام و نشاں تک نہ تھا۔ آدھے گھنٹے تک وہ تیرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اُس کے پاؤں شل ہونے لگے۔ طاقت جواب دینے لگی اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کی جان نکل رہی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''ابّا۔۔۔! پیارے ابّا! ہم ڈوب رہے ہیں۔ خُدا کو یاد کیجیے۔''

یکا یک کسی کی آواز آئی۔ ”کون ڈوب رہا ہے؟“

اِس آواز سے پنا کو کی ہمّت بندھی۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”میں اور میرے ابّا۔“

”آہا۔۔۔! یہ آواز تو میں پہچانتی ہوں۔ تُم پنا کو تو نہیں؟“

”وہی۔۔۔ وہی ہوں۔“ پنا کو نے کہا۔ ”آپ۔۔۔ آپ کون ہیں؟۔۔۔ ارے! آپ تو وہی ایل مچھلی ہیں جو وہیل مچھلی کے پیٹ میں تھیں۔ آپ کیسے بچ نکلیں!“

”تمہارے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ تُم نے مُجھے راستہ دِکھایا تھا اور اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

”آپ دیکھ رہی ہیں، میں ڈوب رہا ہوں۔ کیا آپ مُجھے اور میرے والد

صاحب کو کنارے تک پہنچا سکتی ہیں؟"

"ضرور ضرور!" ایل مچھلی نے کہا۔ "تُم دونوں میری دُم پکڑ کر لٹک جاؤ۔ منٹوں میں کنارے لگائے دیتی ہوں۔"

دونوں باپ بیٹے ایل کی دم سے چِمٹ گئے اور اُس نے تھوڑی دیر میں اُنہیں کنارے پر پہنچا دیا۔ خُشکی پر پہنچ کر دونوں خوشی سے ناچنے لگے۔ پنا کو نے ایل کا بہت شکریہ ادا کیا اور باپ کو لے کر آگے چل پڑا۔

صُبح ہونے والی تھی۔ مشرق کی طرف ہلکا ہلکا اُجالا ہونے لگا تھا۔ کُچھ دُور گئے ہوں گے کہ سامنے ایک بستی دِکھائی دی۔ دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ بستی کے پاس پہنچ کر پنا کو نے گیپتو کو ایک درخت

کے تلے بیٹھا دیا اور بولا۔ ”آپ یہاں بیٹھیے۔ میں کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ خالی پیٹ تو اب ایک قدم بھی نہیں چلا جائے گا۔“

پنا کو بستی میں داخل ہوا ہی تھا کہ اُسے ایک کسان دِکھائی دیا، وہ کاندھے پر ہل رکھے کھیت پر جا رہا تھا۔ پنا کو نے اُسے روک لیا اور بڑی عاجزی سے بولا۔ ”بھائی! میں اور میرا بوڑھا باپ کل سے بھوکے ہیں، خُدا کے لیے کچھ کھانے کو دو۔“

کسان بولا۔ ”بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟۔۔۔ ہٹّے کٹّے ہو، کام کیوں نہیں کرتے؟“

”آپ مُجھے کام بتائیے۔ جو کہیں گے، کروں گا۔“ پنا کو نے سینہ تان کر کہا۔

”آؤ، میرے ساتھ کھیت پر چلو۔“ کسان نے کہا۔

کھیت پاس ہی تھا۔ ایک طرف کنواں تھا۔ کسان نے کہا۔ ”اِس کنویں میں سے سو ڈول پانی نکال کر کھیت میں ڈالو۔ میں تمھیں روٹی دوں گا۔“

پنا کو نے جلدی سے آستینیں چڑھائیں اور پانی کھینچنا شروع کر دیا۔ زندگی میں یہ پہلا کام تھا جو اس نے کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا سانس پھُول گیا اور وہ سر سے پیر تک پسینے میں نہا گیا، لیکن اس نے ہمّت نہیں ہاری۔ ڈول پر ڈول کھینچتا رہا۔

”شاباش!“ کسان نے اُس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ ”سو ڈول ہو گئے۔ لو! یہ چار روٹیاں تُم بھی کھاؤ اور اپنے باپ کو بھی کھلاؤ۔۔۔ اور ہاں سُنو! اگر کام کرنا چاہو تو میں تمھیں ملازم رکھ سکتا ہوں۔ روٹی کے علاوہ پیسے بھی دوں گا۔“

”اور رہنے کے لیے جگہ بھی۔۔۔؟“ پنا کو نے پوچھا۔

"ہاں، میرا گھر کافی بڑا ہے۔ ایک کوٹھڑی تُم لے لینا۔" کسان نے جواب دیا۔

پنا کو روٹی لے کر باپ کے پاس گیا۔ روٹیاں خوب موٹی موٹی تھیں۔ ساگ بھی بہت سا تھا۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور ٹھنڈا پانی پی کر درخت کے تلے پیر پِسار کر سو گئے۔

پنا کو دوسرے دِن سے کسان کے ساتھ کام کرنے لگا۔ کُچھ دِن بعد اُس نے ٹوکریاں بُننا بھی سیکھ لیا۔ اب فالتو وقت میں وہ ٹوکریاں بُنا کرتا اور اُنہیں بیچ کر مہینے میں پندرہ بیس روپے کما لیتا۔ اب وہ بہت نیک لڑکا بن گیا تھا۔ نہ کسی سے لڑائی، نہ جھگڑا۔ بس اپنے کام سے کام۔ شرارت کرنا تو کُجا، کسی دوسرے کو بھی شرارت کرتے دیکھتا تو اُسے منع کرتا۔ اِس طرح پانچ مہینے گُزر گئے۔

اب اُس کے پاس کافی پیسے جمع ہو گئے تھے۔ اُس نے سوچا، کُچھ کپڑے بنا لوں۔ اپنے بھی اور اپنے ابّا کے بھی۔ اُس نے گیپیتو سے کہا تو اس نے خوشی سے اجازت دے دی۔

پنا کو پیسے لے کر بازار کی طرف چلا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ ایک راہ گیر اُسے دیکھ کر رک گیا اور اس طرح دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پنا کو کو بڑا تعجّب ہوا مگر وہ رُکا نہیں، چلتا ہی گیا۔

"میاں صاحب زادے! ذرا سُننا۔" اُس آدمی نے آواز دی۔

پنا کو رُک گیا اور بولا۔ "فرمایئے!"

"تمہارا نام پنا کو تو نہیں؟ وہ پنا کو جو ایک پری کے ہاں رہتا تھا؟"

"جی ہاں، میں وہی پنا کو ہوں۔" پنا کو نے جلدی سے کہا۔ "آپ مُجھے پہچانتے ہیں؟"

اس آدمی نے کہا۔ ”میں پری کے پڑوس میں رہتا ہوں۔“

”فرمایئے، پری کا کیا حال ہے؟ خیریت سے ہیں وہ۔ میری حالت ذرا اچھّی ہو جائے تو میں ملنے جاؤں گا۔ اب۔۔۔ اب میں نیک لڑکا بن گیا ہوں۔“ پنا کو ایک ہی سانس میں سب کُچھ کہہ گیا۔

”لیکن۔۔۔“ اُس آدمی نے گلا صاف کرنے کہا۔ ”تمہیں یہ سُن کر افسوس ہو گا کہ پری ایک سال سے بہت سخت بیمار ہے۔ جتنا جمع جتھا تھا، وہ دواؤں پر اُٹھ گیا۔ اب یہ حالت ہے کہ روٹی کھانے تک کو پیسے نہیں۔۔۔ افسوس!“

پنا کو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا۔ ”یہ رقم پری کو دے دینا۔ چند روز بعد میں بھی آؤں گا اور۔۔۔ اور بھی پیسے لاؤں گا۔“

وہ آدمی پیسے لے کر چلا گیا۔

پنا کو خالی ہاتھ گھر آیا تو گیپیتو کو بڑا تعجّب ہوا۔ اُس نے پوچھا۔ ''پنا کو بیٹے! کپڑے نہیں لائے؟''

پنا کو نے اسے سارا واقعہ سُنایا۔ گیپیتو نے خوش ہو کر اُسے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ''شاباش! اب تُم سچ مچ نیک بچّے بن گئے ہو۔''

اُس رات پنا کو نے پری کو خواب میں دیکھا۔ وہ مُسکرا رہی تھی اور بالکل تندرست تھی۔ پری نے کہا۔ ''مُجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی کہ اب تُم نیک لڑکے بن گئے ہو۔ میں نے تمہارا امتحان لینے کے لیے اُس آدمی کو بھیجا تھا۔ میں نہ تو بیمار ہوں اور نہ مُجھے پیسوں ہی کی ضرورت ہے۔ میں نے تُم سے وعدہ کیا تھا کہ جب تُم نیک اور فرماں بردار بچّے بن جاؤ گے تو میں تمہیں سچ مُچ کا لڑکا بنا دوں

گی۔ اب وہ دِن آ گیا ہے، لیکن یاد رکھو، ہمیشہ اچھّے لوگوں کی صُحبت میں رہنا۔ جی لگا کر تعلیم حاصل کرنا اور اپنے باپ اور اُستادوں کا کہا ماننا۔"

پنا کو صُبح کو اُٹھا تو حیرت سے اُچھل پڑا۔ اب وہ لکڑی کا کٹھ پُتلا نہیں تھا بلکہ بالکل انسانوں جیسا بن گیا تھا۔ اُس نے جلدی سے آنکھیں ملیں اور اِدھر اُدھر دیکھا تو دُنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ گھاس پھونس کے جھونپڑے کے بجائے ایک خوب صورت سجے سجائے کمرے میں لیٹا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تو وہ بھی خوب سجا ہوا تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں۔ پنا کو نے ایک الماری کھولی تو وہ طرح طرح کے قیمتی کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُس نے دو تین جوڑے پہن کر دیکھے تو وہ اس کے بالکل ٹھیک آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسی کے لیے سِلوائے گئے ہیں۔ دوسری الماری میں کسی بڑے آدمی کے کپڑے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ گیپتو کے ہیں۔

اُس نے زور سے آواز دی۔ ”ابّا جی۔۔۔! ابّا جان! کہاں ہیں آپ؟“

آواز سُن کر گیپتو دوڑا ہوا آیا اور پنا کو سے لپٹ گیا۔ پنا کو نے کہا۔ ”پیارے ابّا! یہ سب کُچھ اُس پری کی مہربانی ہے۔ اُس نے مُجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں نیک لڑکا بن جاؤں گا تو وہ مُجھے سچ مچ کا لڑکا بنا دے گی۔ پیارے ابّا! اب میں ہمیشہ نیک کام کروں گا۔ جی لگا کر تعلیم حاصل کروں گا۔ آپ جو کہیں گے، وہی کروں گا اور کبھی بُرے لڑکوں کی صُحبت میں نہیں بیٹھوں گا۔“

کُچھ دِن میں گیپتو نے ایک چھوٹی سی دُکان کھول لی۔ پنا کو صُبح اسکول جاتا۔ چھٹّی کے بعد کُچھ دیر کھیلتا، پھر اسکول کا کام کرتا اور اُس کے بعد دُکان پر جا کر گیپتو کا ہاتھ بٹاتا۔ اِس طرح دونوں باپ بیٹے ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔